لکھنؤ
تعمیر حیات
پندرہ روزہ

"خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی"

سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کی قومیت کیا ہے؟ دنیا کی تمام قوموں کی قومیت ملک نسل یا خاندان کی بنیاد پر ہوتی ہے، مثلاً یہودی وہ قوم ہے جو بنی اسرائیل کے خاندان سے ہو، اگر اور کوئی یہودیوں کے تمام معتقدات پر ایمان لائے تو وہ یہودی نہیں ہو سکتا۔ اور اس کو یہودیوں کے ملکی اور مذہبی حقوق نہیں حاصل ہو سکتے۔ یورپین قوموں کی قومیت ملک کی بنا پر ہے، کسی اور ملک کا آدمی اگر عیسائی ہو جائے تو اس کو وہ حقوق حاصل نہیں ہو سکتے جو یورپین کو حاصل ہیں۔ ایک یورپین پادری جب افریقہ یا ایشیا میں عیسائیت کا وعظ کرتا ہے تو لوگوں سے کہتا ہے کہ اگر تم عیسائی ہو جاؤ تو گو تم دنیا میں یورپین حقوق میں ہمسر نہ ہو گے لیکن قیامت میں تم کو اور یورپین کو ایک ہی رتبہ حاصل ہوگا، یعنی یسوع کے دائیں پہلو میں جگہ ملے گی۔

لیکن مسلمانوں کی قومیت نہ ملک پر ہے نہ خاندان پر نہ رنگ پر بلکہ جو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہدے وہ مسلمان ہو کر تمام مذہبی اور ملکی حقوق میں کل مسلمانوں کا ہمسر ہو جاتا ہے، اور بھنگی یا چمار کلمۂ توحید پڑھ کر قسطنطنیہ کی جامع مسجد میں چلا جائے، اور سلطان کے پہلو میں کھڑا ہو جائے تو سلطان کو یہ کہنے کی جرأت نہیں ہو سکتی کہ ہٹ جاؤ۔ ایک چمار شہنشاہ کے پہلو میں کھڑا ہو سکتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس سے بالاتر عدالت سے چمار نے یہ حکم صادر کرالیا ہے کہ "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ" (مسلمان سب بھائی بھائی ہیں)۔ یہ صرف قول نہیں ہے بلکہ اسلام کی ابتدائے تاریخ سے آج تک اعلانیہ اس پر عمل رہا ہے۔ اسی اصول کی بناء پر دنیائے اسلام کے سب سے بڑے تاجدار حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک حبشی غلام کے مرنے پر کہا تھا "اَلْیَوْمَ مَاتَ سَیِّدُنَا" (آج ہمارا آقا مر گیا)۔ اسی اصول نے ایک خواجہ سرا غلام (کافور) کو مصر و شام کا گورنر بنا دیا تھا اور حرمین میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا، اور یہی اصول تھا جس نے عرب و عجم، غلام اور آقا، شریف اور رذیل، امیر اور غریب کا تفرقہ بالکل مٹا دیا تھا۔

کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

اسی بنا پر مسلمانوں کی قومی ترقی اور قومی ضرورت کا مسئلہ دراصل مذہبی ترقی اور مذہبی ضرورت کا مسئلہ ہے، "قوم" کا لفظ جو نہایت بلند آہنگی سے ہزاروں دفعہ دہرایا گیا اور اس نے کوئی زندگی پیدا نہیں کی، اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ لفظ خود غلط تھا۔ اس لفظ کو بدل کر اسلام کا لفظ اختیار کرنا چاہئے۔

ہماری قومیت ہمارا مذہب ہے اور ہم میں یہی لفظ زندگی پیدا کر سکتا ہے۔ قوم کے غلط استعمال سے صرف یہی نقصان نہیں ہوا کہ وہ کوئی زندگی نہیں پیدا کر سکا، بلکہ سخت نقصان یہ ہوا کہ قومی ترقی، قومی تعلیم، قومی زندگی میں مذہبی پابندی اور مذہبی شعائر کا احساس نہیں رہا، یہی وجہ ہے کہ قومی ترقی کا سب سے زیادہ غل مچانے والے مذہب میں سب سے زیادہ بے پروا ہیں۔

(علامہ شبلی نعمانی)

Regd No. LW/NP 56 Phone [illegible]

TAMEER-E-HAYAT

Fortnightly

(NADWATUL-ULAMA LUCKNOW-226007 (INDIA)

A few English works of Maulana Abul Hasan Ali Nadwi.

Islam and the World : *by S. Abul Hasan Ali Nadwi, translated by Dr. M. Asif Kidwai, pp. 210, price Rs. 18/-*

"ISLAM AND THE WORLD belongs to the small class of thoughtful and thought provoking books which inquires into the factors responsible for the rise and decline of Muslims, studies the impact of Islam on the world and intelligently discusses the role of Islam in the world of today and tomorrow. Maulana Nadwi's book provides a rational and historical refutation of the charge often made from several quarters that it is Islam which is responsible for the present backwardness of the Muslims."

ISLAMIC REVIEW
London, November-December, 1961

Western Civilization—Islam and Muslims : *by S. Abul Hasan Ali Nadwi, translated by Dr. M. Asif Kidwai pp. 199, price Rs. 22/- :*

"This book is a whiff of fresh air in the midst of communal madness all round .... It will be serving a great purpose if it can make the Muslim countries, especially the Indian Muslims to some furious thinking in order to extricate themselves from the malaise in which they have been pushed by their static policies and programmes."

THE HINDUSTAN TIMES
Delhi, December 21, 1969

Muslims in India : *by S. Abul Hasan Ali Nadwi, translated by Dr. M. Asif Kidwai, pp. 155, price Rs. 7.00 :*

"After Hunter's MUSALMANS OF INDIA this book may be said to be most useful publication on the subject......

The author "gives a detailed exposition of the achievements of the Muslim scholars in our country and their contribution to the freedom struggle. He demonstrates clearly that in contributing to the classical literature of Arabic and Persian, the Indian Muslims have to their credit a unique achievement, unique in the annals of world literature. By emphasising this aspect the Maulana has given a fitting answer to those historians who consider the period of Islamic domination as a dark age in the history of this sub-continent."

THE STATESMAN
Delhi, December 22, 1963

Religion and Civilization : *by S. Abul Hasan Ali Nadwi, translated by Mohiuddin Ahmad, pp. 120, price Rs. 8/-. :*

"This brief but incisive work comprises the lectures delivered some years ago at the Jamia Millia, Delhi, and deals with the essential questions of eschatology, cosmology and the resultant socio-ethical order. Like Sorokin, he classifies cultures into sensate and idealistic but unlike him develops his own formulation of the revelatory culture, articulated par excellence, in the Islamic faith and culture ...... One gets from this book a broad and overall view of the socio-ethical order based on revealed guidance."

IMPACT INTERNATIONAL
London, May 16, 1971

Saviours of Islamic Spirit : *Vol. I, by S. Abul Hasan Ali Nadwi, translated by Mohiuddin Ahmad, pp. 434, price Rs. 28/- : Vol. II, Price Rs. 35.*

"Syed Abul Hasan Ali Nadwi has rendered a great service not only to Muslim readers but also to the non-Muslims by placing before them the saintly and devout lives of some of the most eminent men not only of Islam but of the world .... One wishes more books like this will come out so as to bring out those aspects of Islam which are not as well known as they ought to be."

NATIONAL HERALD
Lucknow and Delhi. 9th July, 1972

The Four Pillars of Islam : *by S. Abul Hasan Ali Nadwi, translated by Dr. M. Asif Kidwai, pp. 298, price Rs. 22/- :*

"The book deals with the four fundamental duties, *Salat*, *Saum*, *Zakat* and *Haj* and, along with these, their logical advantages and significance and similarities and differences with the modes of worship in other religious communities. It has, thus, at once become a treatise on jurisprudence, scholastic theology and religious teachings and principles."

SIDQ-I-JADID
July 26, 1968

The Musalman : *by S. Abul Hasan Ali Nadwi, translated by Mohiuddin Ahmad, pp. 120, price Rs. 10/- :*

"Designed to present a true picture of the Indian Muslims before the non-Muslims, the book succeeds in portraying their social customs and manners, religious observances and feasts and festivals without either magnifying or concealing any facet of their life. A book which ought to be translated in every Indian language."

SIDQ-I-JADID
Lucknow, July 21, 1972

Faith versus Materialism : *by S. Abul Hasan Ali Nadwi, translated by Mohiuddin Ahmad, pp. 114, price Rs. 10/-.*

"This is a commentary of *Surah Kahf* (The Cave) which occupies a unique place in the Quran ...... In delineating the hidden traits and characteristics of Dajjal the author has brought to light the trickery and swaggering deception of the present-day God-less materialistic civilization. Through his lucid exposition of the message contained in this chapter of the Quran, the author has shown how its teachings can be efficacious in achieving deliverance from these evils.

ISLAM AUR ASR JADID
Delhi, July, 1972

Qadianism : *by S. Abul Hasan Ali Nadwi, translated by Zafar Ishaq Ansari, M. A., pp. 152, price Rs. 15/- :*

"A critical study of the Qadiani Movement in the light of historical research. The book has gone a long way in correcting many misconceptions and errors lending force to the Movement."

New Menace and its Answer : *by S. Abul Hasan Ali Nadwi, pp. 24, price Re. 1.50.*

Glory of Iqbal : *by S. Abul Hasan Ali Nadwi, translated by Dr. M. Asif Kidwai, pp. 228, price Rs. 18/-*

Nadwa Book Depot P.B. 93 Lucknow - 7

لکھنؤ

تعمیر حیات

پندرہ روزہ

شعبۂ تعمیر و ترقی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جلد نمبر ۱۵ | ۱۰ و ۲۵ جنوری ۱۹۷۸ء — یکم محرم الحرام و ۱۵ صفر المظفر ۱۳۹۸ھ | شمارہ نمبر ۵ و ۶

زرِ اشتراک اندرونِ ہند مع محصول ڈاک:
سالانہ: ۱۲ روپے، ششماہی سات روپیہ
فی پرچہ: ۶۰ پیسے
بیرونِ ہند مع محصول ڈاک:
بحری ڈاک سے: ایک پاؤنڈ ۸ شلنگ
ہوائی ڈاک سے: امریکہ و کناڈا اور
یورپین ممالک: ۳ پونڈ
افریقہ، مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید کے ممالک: ۲½ پونڈ
پاکستان: ۳۰ روپے
بنگلہ دیش: ۱۵ روپے

اسحٰق جلیس ندوی

دینی مدارس کے لئے لمحۂ فکریہ!

زیرِ نظر شمارہ میں ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے جلسے میں پیش کردہ ناظم ندوۃ العلماء کی رپورٹ شائع کی جارہی ہے، اس رپورٹ کے بعض نکات دینی مدارس کے اربابِ حل و عقد، اساتذہ، طلبہ، معاونین اور ہمدردوں کو دعوتِ فکر دیتے ہیں۔

دینی مدارس کے موجودہ نظام کا آغاز مسلمانانِ ہند کی تاریخ کے ایک نازک موڑ پر ہوا تھا، مشرق جب مغربی یلغار کے مقابلہ میں بے بس ہو کر تابِ مقاومت کھو چکا تھا ان حوصلہ شکن حالات میں ہمارے اسلاف کی بصیرت و جرأت نے برصغیر میں ان حفاظتی قلعوں کی تعمیر کا کارنامہ انجام دیا، جہاں ہمیں اپنے علم و تہذیب، دین و شریعت، مذہب و عقیدہ، زبان و ثقافت اور اپنی ملی تشخص کی حفاظت و بقا کا سامان کرنا تھا، مدارس عربیہ کی تاریخ، علماء کی خدمات اور ملتِ اسلامیہ کا حال اس پر گواہ ہیں کہ اپنی بے سروسامانی کے باوجود ان درسگاہوں نے اپنے پروگرام و مقاصد کو بروئے کار لانے کی کامیاب جدوجہد کی۔

دینی مدارس اور اس کے نظامِ تعلیم و تربیت کے لئے انگریزی عملداری کا زمانہ ایک آزمائشی دور تھا، بدیسی راج کے خاتمہ اور حصولِ آزادی کی جدوجہد میں دینی مدارس اور ان کے فضلاء نے موثر کردار ادا کیا، ملک آزاد ہوا لیکن اس کے ساتھ ہی دینی مدارس ایک نئے آزمائشی دور میں داخل ہوئے، دورِ آزادی کا امتحان پہلے سے زیادہ سخت اور اپنے عواقب و مضرات کے لحاظ سے دورِ غلامی سے کہیں زیادہ تشویشناک ہے۔

ناظم ندوۃ العلماء نے اپنے خطبہ میں اس خطرہ کی نشاندہی کی ہے جو موجودہ دور کی پیداوار ہے، اور ندوۃ العلماء کے موقر اراکین انتظامیہ کو متوجہ فرمایا ہے کہ ہمیں ملک کے حالات کا وقتاً فوقتاً جائزہ اور نئے بننے والے قوانین کا نوٹس لیتے رہنا چاہئے جن کا تعلق تعلیمی پالیسی اور تعلیم گاہوں سے ہے۔ قانون بنانے والوں کا رجحان، ہوا کا رُخ، چشم و ابرو کا اشارہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے اور طوفان آنے سے پہلے اس کو روکنے کی کوشش شروع کر دینی چاہئے، اس ضمن میں ناظم ندوۃ العلماء نے ہندوستان کی تمام چھوٹی بڑی دینی درسگاہوں میں باہمی تعاون و اشتراک اور اتحاد و تنظیم کی ضرورت پر زور دیا۔

ہندوستان کے سیکڑوں دینی مدارس کا اتحاد اور وفاق وقت کی اہم ضرورت ہے، اب اس مسئلہ کو بے اعتنائی اور سرد مہری کا شکار نہ ہونا چاہئے۔ مسلم عوام پر علماء کا اثر ہے، علماء کا متفقہ لائحہ عمل اور مدارس کا وفاق ملک و معاشرے میں مثبت نتائج پیدا کر سکتا ہے۔

ہمارا ملک اس قیادت و رہنمائی سے محروم ہے جس کے بغیر حقیقی ترقی، امن و عافیت، سکون و اطمینان اور محبت و رواداری کی فضا پیدا نہیں ہو سکتی۔ وہ ہے اخلاقی قیادت۔

ناظم ندوۃ العلماء نے ملک میں اخلاقی قیادت کے خلاء، اور اس کے سنگین عواقب کی نشاندہی کرتے ہوئے دینی مدارس کے طلبہ اور فضلاء کو ان کے منصب و مقام اور ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہوئے فرمایا کہ ملکی و قومی خسارے اور حادثے سے صرفِ نظر کرنا اور اپنے خول میں بند رہنا اس وقت کسی طرح جائز نہیں، اس لئے کہ یہ صورتِ حال اگر کچھ دن اور باقی رہی تو وہ شاخ ہی باقی نہ رہے گی جس پر دینی تعلیم اور اخلاقی اقدار کے نشیمن قائم ہیں۔

اب وقت آگیا ہے کہ مدارس کے طلبہ، اساتذہ اور ان کے کارکن اور ذمہ دار اس آگ کو بجھانے کے لئے کم سے کم اپنا تھوڑا سا وقت فارغ کریں جو سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لیتی جارہی ہے، اور اس پر تھوڑا سا پانی ڈالنے کے لئے ابھی ملک کی سیاسی پارٹیوں اور ان کے رہنماؤں کے پاس وقت نہیں۔ یہ کام صرف وہی گروہ کر سکتا ہے، جو عقیدہ اور اخلاق کی دولت و طاقت سے ابھی محروم نہیں ہوا، اور جس کے سامنے حکومت کی کرسیاں اور جاہ و منصب کے حصول کا مقصد نہیں، ملک کی اخلاقی قیادت کا یہ خلا (جو زیادہ دنوں تک باقی نہیں رہ سکتا) صرف وہ جماعت پُر کر سکتی ہے جو ہر طرح کی ذاتی، جماعتی، گروہی اور سیاسی اغراض سے پاک ہو، ہم اہلِ مدارس کو دعویٰ ہے کہ ہم ایسے بے لوث، خدا ترس، انسانیت دوست، دردآشنا، ایثار پیشہ سخت کوش و جفاکش افراد پیدا کرتے ہیں، یہ وہ کام ہے جس سے ہمارے مدارس نہ صرف زندہ رہنے کا حق حاصل کریں گے، بلکہ وہ اس ملک اور یہاں کے عوام کی زندگی کا باعث بنیں گے۔

ندوۃ العلماء کے مقاصد میں ایک اہم مقصد نصابِ تعلیم کی اصلاح تھا، ناظم ندوۃ العلماء کے الفاظ میں اب یہ اصول و مقصد نظری، محتاجِ ثبوت اور متنازع فیہ نہیں رہا بلکہ بدیہی حقیقت بن گیا ہے۔

ہر دور میں نصابِ تعلیم پر نظرِ ثانی اور اس میں اور بدلتی ہوئی زندگی میں مطابقت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

مولانا نے اس پر افسوس کا اظہار فرمایا کہ ابھی تک ہندوستان کے بہت سے عربی مدارس نے اس راستہ پر سفر کا آغاز نہیں کیا، بہت جگہ ابھی تک قدیم نصاب کو تقدس و عصمت کا وہ مقام حاصل ہے، جو کسی ماورا انسانی فکر یا عمل کو حاصل ہونا چاہئے۔

ہمیں امید ہے کہ ناظم ندوۃ العلماء کی رپورٹ کے یہ تین نکات دینی مدارس کے اساتذہ، فضلاء، طلبہ اور کارپردازوں، کارکنوں، ہمدردوں اور معاونین کی فکر و توجہ اور عملی اقدام کے مستحق ہوں گے۔

"تعمیرِ حیات" کا زیرِ نظر شمارہ ۱۰ و ۲۵ جنوری ۱۹۷۸ء کے دو شماروں پر مشتمل ہے، زائد ۲۴ صفحات۔ متنوع مواد، قیمت ایک روپیہ

تعمیرِ حیات کے آئندہ شمارہ میں ان شاء اللہ سرزمین مالوہ کی رُوداد سفر اور اہم تقاریر شائع ہوں گی۔

(مینیجر تعمیر حیات)

تعلیم القرآن

از: مولانا محمد اویس ندوی مرحوم

بیوہ عورتوں کے ساتھ برتاؤ:

وانکحوا الایامیٰ منکم۔ (نور ۴) — اپنے میں سے بے شوہر والی عورتوں کا نکاح کرو۔

وہ عورتیں جن کے شوہروں کا انتقال ہو گیا ہے۔ اب وہ بے یار و مددگار ہیں، نہ ان کے کھانے پینے کا کہیں سہارا ہے، نہ رہنے سہنے اور تن ڈھکنے کا ٹھکانا۔ اسلام کا حکم ہے کہ ان کے ساتھ نیک برتاؤ کیا جائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیوہ اور مسکین کے لئے دوڑ دھوپ کرنے والا ایسا ہے جیسا خدا کی راہ میں دوڑنے والا، فرمایا، بیوہ اور غریب کے لئے دوڑ دھوپ کرنے والا خدا کی راہ کے مجاہد کی طرح ہے اور اس کے برابر ہے جو دن بھر روزہ اور رات بھر نماز پڑھا کرے۔

بعض لوگ جہالت سے بیوہ عورتوں کو منحوس سمجھتے ہیں، یہ اسلامی تعلیم کے خلاف ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن میں سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھولوں گا تو دیکھوں گا کہ ایک عورت مجھ سے بھی پہلے اندر جانا چاہتی ہے میں پوچھوں گا تو کون ہے؟ تو وہ کہے گی کہ میں ایک بیوہ ہوں، جس کے چند ننھے یتیم بچے تھے۔

بیوہ عورتوں کے ساتھ ضروری سلوک یہ ہے کہ کسی اچھے آدمی کے ساتھ عدت گذرنے کے بعد ان کا عقد کر دیا جائے۔ ہمارے حضور صلی اللہ نے ۲۵ برس کی عمر میں ۴۰ برس کی ادھیڑ بیوہ حضرت خدیجہؓ سے شادی کیا، ان کے بعد وقتاً فوقتاً آٹھ بیوہ عورتوں سے حضورؐ نے نکاح کیا۔

لڑکیوں کے ساتھ برتاؤ:

واذا بُشِّرَ احدھم بالانثیٰ ظلَّ وجہہٗ مسودًّا وھو کظیم یتواریٰ من القوم من سوء ما بُشِّر بہٖ۔ (نحل ۔ ۷)

اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کا منہ کالا پڑ جاتا ہے، اور غصہ کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے، اس خوشخبری کے رنج سے وہ لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا ہے۔

عام طور سے دیکھا جاتا ہے کہ جب کسی کے گھر میں لڑکے کے بجائے لڑکی پیدا ہوتی ہے تو زیادہ خوشی نہیں منائی جاتی ہے بلکہ اکثر لوگ، لڑکی پیدا ہونے پر رنج ظاہر کرتے ہیں، عرب والوں کا بھی یہی حال تھا، وہ لوگ تو اپنی لڑکیوں کو زندہ زمین میں گاڑ دیتے تھے۔

ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آکر اپنا واقعہ سنایا کہ اسلام سے پہلے میری ایک لڑکی تھی جب میں اس کو بلاتا تو دوڑ کر میرے پاس آتی، ایک دن میرے بلانے پر خوش خوش دوڑی آئی میں آگے بڑھا اور وہ میرے پیچھے پیچھے چلی آئی، میں آگے بڑھتا چلا گیا، جب ایک کنوئیں کے پاس پہونچا جو میرے گھر سے کچھ دور نہ تھا اور لڑکی بھی اس کے قریب پہونچی، تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کنوئیں میں ڈالدیا اور وہ ابا، ابا کہہ کر پکارتی رہی! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قصہ سنکر اتنا روئے کہ داڑھی تر ہو گئی، اور فرمایا کہ جاؤ، اسلام کے بعد پہلے کے گناہ معاف ہو گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، خدا نے تم پر ماؤں کی نافرمانی اور لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینا حرام کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے ہی سے نہیں روکا، بلکہ انکی عزت بھی بڑھائی، فرمایا جو دو لڑکیوں کی پرورش کرے، یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائیں تو قیامت میں میرے اس طرح (دو انگلیوں کو اٹھا کر فرمایا) قریب ہوگا۔

صحابہ کرامؓ کا یہ حال تھا کہ لڑکیوں کی پرورش کے لئے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے چلنے کا ارادہ کیا، تو حضرت حمزہؓ کی یتیم بچی امامہ، چچا چچا کہتی ہوئی دوڑی آئی، حضرت علیؓ نے ہاتھوں میں اٹھا لیا، اور حضرت فاطمہ کو دیا کہ یہ تو تمہارے چچا کی بیٹی ہے، حضرت علیؓ کے بھائی حضرت جعفرؓ نے کہا کہ بچی مجھ کو ملنا چاہئے کہ یہ میرے چچا کی لڑکی ہے، اور اسکی خالہ میرے گھر میں ہے، حضرت زیدؓ نے آگے بڑھ کر کہا کہ حضور یہ لڑکی مجھ کو ملنا چاہئے کہ حمزہ میرے دینی بھائی تھے، حضرت علیؓ نے کہا کہ یہ میری بہن بھی ہے، اور پہلے میری ہی گود میں آئی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ خالہ ماں کے برابر ہوتی ہے، اس کی خالہ کے گود میں دے دیا۔

محسنِ انسانیتؐ نے فرمایا

حاکم کو چاہیئے کہ وہ لوگوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرے اور سختی و درشتی کا معاملہ نہ کرے۔

عن عائشۃؓ قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللّٰھم من وُلّیَ من امر امتی شیئًا فشق علیھم فاشقق علیہ ومن وُلّیَ من امر امتی شیئًا فرفق بھم فارفق بہٖ۔

(رواہ مسلم ۔ مشکوٰۃ صفحہ ۳۲۱)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ الٰہی میری امت میں سے جس کو بھی کسی شعبہ کی خدمت کا موقع ملے اور وہ لوگوں کے ساتھ سختی کا معاملہ کرے تو تو بھی اس کے ساتھ سختی کا معاملہ فرمانا اور جو ان میں میری امت کے ساتھ نرمی کرے تو تو بھی اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ فرمانا۔

عن عائشۃؓ قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ادرؤا الحدود عن المسلمین ما استطعتم فان کان لہٗ مخرج فخلوا سبیلہٗ، فان الامام ان یخطئ فی العفو خیرٌ من ان یخطئ فی العقوبۃ۔

(رواہ الترمذی وقال قد روی عنھا و لم یرفع وھو اصح مشکوٰۃ صفحہ ۳۱۱)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکام کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ جہاں تک ممکن ہو حدود کے معاملہ میں مسلمانوں کے ساتھ وہ پہلو اختیار کرو جس میں وہ سرکاری مقرر کردہ سزا سے بچ جائے، تو اگر مقدمہ میں کوئی پہلو ملزم کی رہائی کا نکل سکتا ہو تو اس کی بنا پر ملزم کو رہا کر دو، کیونکہ ملزم کو معاف کر دینے میں امام کا غلطی کرنا غلط طور پر کسی غیر مجرم کو سزا دینے کے مقابلہ میں بہتر ہے۔

شرح: بارگاہِ رسالت کی دوربین نظریں یہ دیکھ رہی تھیں کہ خلافتِ راشدہ کا دور ہمیشہ قائم رہنے والا نہیں اور آئندہ چل کر حاکموں کے دماغ میں حکومت کا نشہ ہو جانا بعید نہیں اس لئے صحیح مسلم کی حدیث میں حکمرانوں کو تنبیہ کیا ہے کہ اگر وہ اپنے عارضی دورِ حکومت میں میری امت کے ساتھ محض اپنی حکومت کے نشہ میں کوئی سختی کا معاملہ کریں گے تو میری بددعا کے مستحق ہوں گے ظاہر ہے کہ آپ کے بددعائیہ کلمات کا اثر حکمرانوں کے دماغوں پر جتنا پڑ سکتا ہے اتنا اثر صرف ضوابط اور آئین کا نہیں پڑ سکتا۔

تعجب ہے کہ ایک شخص جو ابھی ابھی ہمارا بھائی بنا ہوا بیٹھا تھا وہ اگر ظاہری طور پر ہمارے انتخاب سے حکومت کی کرسی پر جا بیٹھتا ہے تو اس کو یہ خیال باقی نہیں رہتا کہ وہ بہت قلیل مدت کے بعد ضابطہ میں یا کسی حادثہ میں مبتلا ہو کر پھر ہمارے ساتھ بیٹھنے والا ہے، اس لئے اس کو اپنے دورِ حکومت میں اپنی اسلامی برادری کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہئے؟ اگر شرعی لحاظ سے یہ جذبہ دل میں پیدا نہیں ہوتا تو ایک ہوشمند دماغ میں کم از کم عقلی لحاظ سے تو پیدا ہونا ضروری ہے۔

دوسری حدیث محدثین کے نزدیک اگرچہ صحیح یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کا قول ہے تاہم اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ حدود یعنی سرکاری سزاؤں کے معاملہ میں شریعت کا مقصد حتی الوسع اغماض و چشم پوشی کرنا ہے، لیکن اگر کوئی قانونی پہلو نہ نکل سکتا ہو تو پھر ظاہر ہے کہ سزا کا حکم دینا یہ بہرحال تحفظ قانون کے لئے ناگزیر ہے، یہاں جلد باز طبائع اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں کہ اس طریقہ سے کھلم کھلا جرائم کی کثرت ہو جائے گی کیونکہ ان حدیثوں کا منشاء اور ان کی اصل روح حکام کو جور و ظلم سے روکنا ہے۔

اسلامی قانون سے نامانوس دماغوں کے لئے اس سے زیادہ تفصیل کرنی بھی ناکافی ہے اور حقیقت پسندوں کے سمجھنے کے لئے یہ چند کلمات بھی کافی ہیں۔

نوٹ: حدود سے مُراد یہاں قانونِ تعزیرات کا ایک خاص حصہ ہے جیسے حدِ زنا وغیرہ اس کی قدرے تفصیل آئندہ آئے گی۔

ندوۃ العلماء دینی، تعلیمی و تربیتی تحریک ہے، اسکو ملک کے حالات کا وقتاً فوقتاً جائزہ اور نئے قوانین کا نوٹس لیتے رہنا چاہیئے۔

ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کا جلسہ ۲۵ دسمبر ۱۹۷۷ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے عباسیہ ہال میں منعقد ہوا، اس جلسے میں ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے جو رپورٹ پیش کی اس کے چند اقتباسات افادۂ عام کی غرض سے شائع کئے جا رہے ہیں۔

جن ارکین مجلس انتظامی نے اس جلسے میں شرکت کی، ان میں سے چند نام یہ ہیں:۔ مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا محمد عمران خانصاحب ندوی، مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، حکیم عبدالحمید صاحب متولی ہمدرد دواخانہ دہلی، مولانا ابوبکر حسنی، مولانا حکیم محمد زماں صاحب، مولانا عبیدالرحمن خاں شروانی، ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی، مولانا محب اللہ ندوی، مولانا محمد معین اللہ ندوی (نائب ناظم ندوۃ العلماء)

حضرات ارکان مجلس انتظامی ندوۃ العلماء!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

میں آپ حضرات کا آپ ہی کے ایک نمائندہ اور نائب کی حیثیت سے اس موقر مجلس میں خیر مقدم کرتا ہوں، میرے لئے اس کا جواز اور موقع محض تقسیم عمل کے اصول پر ہے، ورنہ آپ کی حیثیت میزبان کی ہے، نہ کہ مہمان کی۔ ندوۃ العلماء میں اس کے تاریخ ساز ۸۵ سالہ جشن سے لیکر جو اکتوبر، نومبر ۱۹۷۵ء کی تاریخوں میں منعقد ہوا تھا معمولی سے جلسہ اور تقریب تک آپ ہی تمام آنے والے مہمانوں اور واردین و صادرین کے میزبان ہوتے ہیں، خواہ آپ اس موقع پر موجود ہوں یا نہ ہوں، ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی ندوۃ العلماء اور دارالعلوم کے انتظام اور انصرام اس کی پالیسی وضع کرنے اور اہم امور کے فیصلے میں آخری اور سب سے بڑی با اختیار جماعت ہے، اس تحریک و ادارہ کے بانی اور ذمہ داروں کی شروع سے کوشش رہی ہے کہ اس مجلس کی رکنیت کے لئے ہندوستان کے موقر ترین اور ممتاز ترین اصحاب کا جو ملت کا صحیح درد بھی رکھتے ہوں اور دینی تعلیم و علوم اسلامیہ کی بقا و ترقی اور وقت کی ضرورت کے مطابق علماء کے تیار کرنے میں اپنے قیمتی مشوروں سے مدد کرسکتے ہوں، انتخاب کیا جائے، ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کا ہر دور میں یہ امتیاز رہا ہے اور اب بھی وہ اس روایت کو قائم کئے ہوئے ہے۔

میں اُن موقر ارکان کے ساتھ جو سالہا سال سے اس مجلس کے رکن چلے آرہے ہیں اُن معزز ارکان کو بھی "خوش آمدید" کہتا ہوں جو اس نئے انتخاب سے مجلس کے ارکان منتخب ہوں گے۔ میری دعا ہے کہ اُن کا انتخاب ہر طرح سے مبارک و مسعود ثابت ہو اور اس تحریک و ادارہ کو ان کے علم و تجربہ اور خلوص و دردمندی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا موقع ملے۔

حضرات! ہم اس وقت ملک کے کسی قدر بدلے ہوئے حالات میں جمع ہو رہے ہیں ندوۃ العلماء اور اس کا دارالعلوم اگرچہ کچھ متعین مقاصد رکھتا ہے، اور اس کا متعین دائرۂ عمل ہے، وہ اصلاً ایک دینی، تعلیمی و تربیتی تحریک ہے، لیکن سمندر کی طرح خشکی میں کسی جزیرہ کی گنجائش نہیں، سمندر کی بے رحم موجیں جزیرہ کے حدود کا احترام اور اس پر رہنے والوں کی رعایت کرسکتی ہیں، (اور ہزارہا سال سے کرتی رہی ہیں لیکن خشکی بالخصوص کسی برّ عظیم پر (جو اپنا جمہوری آئین و دستور رکھتی ہے جس کا تعلق قومی زندگی کے ہر شعبہ سے ہے) چلنے والی تیز و تند، اور گرم و سرد ہوائیں کسی قلعہ یا حصار کو بھی اپنی لپیٹ میں لئے، اور اپنے اچھے برے اثرات ڈالے بغیر نہیں چھوڑتیں، ہمیں (ایک ایسی منتخب اور ذی ہوش مجلس میں جیسی کہ ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی ہے) ملک کے حالات کا وقتاً فوقتاً جائزہ اور نئے بننے والے قوانین کا نوٹس لیتے رہنا چاہیئے جن کا تعلق تعلیمی پالیسی اور تعلیمگاہوں سے ہے، اور خواہ وہ کتنے ہی سرکاری اور غیر سرکاری تعلیمگاہوں سے متعلق ہوں اُن میں قانون بنانے والوں کا رجحان، ہوا کا رخ، چشم و ابرو کا اشارہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے، اور طوفان کے سر پر آجانے سے پہلے اس کو روکنے کی کوشش شروع کر دینی چاہیئے۔ اس سلسلہ میں ہمیں مرکز اور ریاستوں کی سطح پر اُن تمام قوانین کا جائزہ لینا چاہیئے جن کا تعلق تعلیمی سفارشات یا اصلاحات اور امدادی مدارس اور مکاتب اسلامیہ سے ہے اور جن سے ہوا کا رُخ معلوم ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں ہندوستان کی اُن تمام دینی، بڑی چھوٹی تعلیمگاہوں کے تعاون بحث و مذاکرہ اور اتحاد و تنظیم کی ضرورت ہے جو ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیلی ہوئی ہیں اور جن کا اب بھی مسلمانوں کی اکثریت پر بڑی سے بڑی تنظیم، اور بڑی سے بڑی سیاسی پارٹی سے زیادہ اثر ہے، اور جن کا کارپرداز و فضلاء مسلمانوں کی زندگی میں ہر فرد ملت سے زیادہ دخیل، اور ہر سیاسی قائد سے زیادہ اثر انداز ہیں، ہمیں اس موقع پر بغیر کسی تکلف اور تواضع کے یہ ثابت کر دینا چاہیئے کہ ہم نفع و ضرر دونوں کی صلاحیت رکھتے ہیں، خواہ اس کے عملی ثبوت کی ضرورت (خوش قسمتی سے) مدتوں پیش نہ آئے، ہمیں اس موقع پر ترجمان حقیقت اقبالؒ کے ان دو شعروں کو پیش نظر رکھنا چاہیئے ؎

تمیز خار و گل سے آشکارا
نسیم صبح کی روشن ضمیری
حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے
اگر کانٹوں میں ہو خوئے حریری

اسی طرح دینی و عربی مدارس کے طلبہ و فضلاء، کارکنوں اور کارپردازوں کو ملک کے اس اخلاقی انحطاط، زوال آدمیت، دولت پیدا کرنے کے جنون، لاقانونیت اور تشدد کے بڑھتے ہوئے رجحان، اور اجتماعی مصلحت پر ذاتی مفاد کو ترجیح دینے کے اس قومی مزاج سے خواہ وہ ذاتی مفاد کتنا ہی حقیر اور غیر مرئی اور ملکی و قومی خسارہ اور حادثہ کتنا ہی عظیم اور مہیب ہو صرف نظر کرنا، اور اپنے خول میں بند رہنا اس وقت کسی طرح جائز نہیں، اس لئے کہ یہ صورت حال اگر کچھ دن اور باقی رہی تو وہ شاخ ہی باقی نہ رہے گی جس پر دینی تعلیم اور اخلاقی اقدار کے یہ نشیمن قائم ہیں۔

> "تمام دینی تعلیمگاہوں کے تعاون بحث و مذاکرہ اور اتحاد و تنظیم کی ضرورت ہے"

اس خطرہ کی سنگینی کا احساس سب سے زیادہ اُس جماعت کو ہونا چاہیئے اور اس کے ڈر سے اس کی راتوں کی نیند اڑ جانی چاہیئے جس نے تعلیمات نبوتؐ میں اس کشتی کی حکیمانہ شان یہ ہے جس کے بالانشینوں نے اپنی سہولت کی خاطر کشتی کی بنا پر کشتی کے نیچے رہنے والوں کو کشتی میں سوراخ کر لینے اور اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے پانی بھر لینے کی اجازت دیدی تھی اور جو قرآن مجید کے اس انذار و تنبیہ کو براہ راست اسکی زبان میں سمجھنے کی اہل ہے کہ " واتقوا فتنة لا تصيبن الذين ظلموا منكم خاصة واعلموا ان الله شديد العقاب " اس لئے اب وقت آگیا ہے کہ مدارس کے طلبہ و اساتذہ اور ان کے کارکن و ذمہ دار اس آگ کو بجھانے کے لئے کم سے کم اپنا تھوڑا سا وقت فارغ کریں جو سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لیتی جا رہی ہے، اور اس پر تھوڑا سا پانی ڈالنے کے لئے بھی ملک کی سیاسی پارٹیوں اور ان کے رہنماؤں کے پاس وقت نہیں، اور اگر وہ میدان میں آئیں بھی تو ایک طرف تو ملک کو بار بار تجربوں کے بعد اُن پر اعتماد نہیں رہا، دوسرے اُن کے پاس وہ زبان اور پیرایۂ بیان نہیں جس کو دل اور ضمیر سنتے اور سمجھتے ہیں، یہ صرف وہی گروہ کرسکتا ہے، جو عقیدہ اور اخلاق کی دولت و طاقت سے ابھی محروم نہیں ہوا، اور جس کے سامنے حکومت کی کرسیاں اور جاہ و منصب کے حصول کا مقصد نہیں، ملک کی اخلاقی قیادت کا یہ خلا (جو زیادہ دنوں تک باقی نہیں رہ سکتا) صرف وہ جماعت پُر کرسکتی ہے جو ہر طرح کی ذاتی جماعتی، گروہی اور سیاسی اغراض سے پاک ہو اور جس کی تربیت اس اصول پر ہوئی ہو کہ ؎

عدیل ہمت ساقیست فطرت عرفی
کہ حاتم دگراں و گدائے خویشتن است

اور ہم اہل مدارس کا دعویٰ ہے کہ ہم ایسے ہی بے لوث، خدا ترس، انسانیت دوست، درد آشنا، ایثار پیشہ، سخت کوش و جفاکش افراد پیدا کرتے ہیں، یہ وہ کام ہے جس سے ہمارے مدارس نہ صرف زندہ رہنے کا حق حاصل کریں گے بلکہ وہ اس ملک اور آبادی کی زندگی کا باعث بنیں گے، اور اس طرح ان کو اپنی ضرورت و راحت ←

کا بار بار ثبوت دینے کی ضرورت نہ ہوگی، بلکہ ان کو محبوبیت و مقتدائیت کا وہ مقام حاصل ہوگا جو انسانیت کے بے لوث خادموں، اور کسی ملک و قوم کی کشتی حیات کو ڈوبنے سے بچا لینے والوں کو حاصل ہوتا ہے،

"وفی ذلک فلیتنافس المتنافسون"

حضرات! اگرچہ ندوۃ العلماء نے اپنے بہت سے مقاصد میں کامیابی حاصل کرلی ہے اور اس کے بہت سے اصول جو پہلے نظری محتاج ثبوت اور متنازع فیہ تھے، اب بدیہی حقائق بن گئے ہیں، مثلاً نصاب تعلیم اور علوم اسلامیہ کا ایک جامد اور متحجر جسم ہونے کے بجائے ایک ذی حیات جسم ہونا جس میں نمو اور ارتقا اور زمانہ کا ساتھ دینے اور اس کی نت نئی ضروریات کو پورا کرنے کی صلاحیت دائمی طور پر پائی جاتی ہے، اس لئے ہر دور میں نصاب تعلیم پر نظر ثانی اور اس میں اور بدلتی ہوئی زندگی میں مطابقت پیدا کرنے کی ضرورت ہے،

لیکن ابھی تک ہندوستان کے بہت سے عربی مدارس نے اس راستہ پر سفر کا آغاز نہیں کیا، بہت جگہ ابھی تک قدیم نصاب کو تقدس و عصمت کا وہ مقام حاصل ہے، جو کسی ماورائے انسانی فکر یا عمل کو حاصل ہونا چاہیئے، ندوۃ العلماء نے عربی زبان و ادب کی حد تک ایسا نصاب تیار کر لیا ہے جس کے متعدد اجزاء کو ترقی یافتہ عرب ممالک نے جن کی زبان عربی ہے، اور جنکے پاس ترتیب و تالیفِ نصاب کے بہترین وسائل ہیں، اپنایا ہے، اور ان کو اپنے نصاب میں داخل کر لیا ہے،

ندوۃ العلماء کو بھی اس کی ضرورت ہے کہ وہ اُن چند کتابوں کے علاوہ جن سے کسی دور میں استغناء نہیں ہوسکتا اپنے نصاب میں خود کفیل بن جائے، یہ کام محدود پیمانہ پر شروع کر دیا گیا ہے، ضرورت ہے کہ ایک طرف اس کی رفتار کو تیز کیا جائے، اور یہ اسوقت ہوسکتا ہے کہ جب ہمیں ماہرین فن کی خدمات حاصل ہوں، اور خود ہمارے ان اساتذہ کو جو اپنے اپنے موضوع پر اس کی صلاحیت رکھتے ہیں اس کام کے لئے وقت ملے، افسوس ہے کہ اسٹاف کی کمی اور تعلیم کے بار کی وجہ سے وہ خاطر خواہ اس کی طرف توجہ نہیں کرسکے، دوسری طرف اصلاح نصاب کی آواز کو اور زیادہ وسیع اور طاقتور بنایا جائے اور ندوۃ العلماء کی اس دعوت کو پھر زندہ کیا جائے، جو اس خیال سے پست یا خاموش ہوگئی تھی کہ یہ اصول عام طور پر تسلیم کیا جا چکا ہے لیکن اب پھر ضرورت ہے کہ اس تحریک و دعوت کو زندہ اور تازہ کیا جائے اور اس دعوت کو بلند آہنگی کے ساتھ پیش کیا جائے، کہ ے

نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

اسی طرح سے رفع نزاع باہمی (بالخصوص علماء کے آپس کے اختلافات کے رفع کرنے کی کوشش) اور اصلاح رسوم کا وہ کام بھی پھر تندہی اور سرگرمی سے شروع ہونا چاہیئے جو ندوۃ العلماء کے بنیادی مقاصد میں تھا، اور جس کی ضرورت آج بھی اسی طرح محسوس ہو رہی ہے، جیسی پہلے دن تھی،

اس کے لئے ایک تو اس کی ضرورت ہے کہ ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسے اس کی پرانی روایت اور دستور کے مطابق ہندوستان کے مرکزی شہروں میں ہوں، اور ان کو اس دعوت کا بھی خصوصی پلیٹ فارم بنایا جائے، دوسرے ندوۃ العلماء کے پاس ایسے باصلاحیت واعظ اور سفیر ہوں، جو خاص اس مقصد کے لئے ملک کا دورہ کرتے رہیں اور عام مسلمانوں و انجمنوں کی طلب پر ان کو بھیجا جاسکے، اس کے لئے یہ بھی مفید ہوگا کہ اس کے آرگن پندرہ روزہ "تعمیر حیات" کو اس کا ذریعہ بنایا جائے، اور اس کی توسیع اشاعت کی پوری کوشش کی جائے،

حضرات! ناظم ندوۃ العلماء کی سالانہ رپورٹ کا ایک اہم عنصر جو مجلس انتظامی میں پیش کیا جائے ندوۃ العلماء، اور دارالعلوم کے ضروری حالات کا تذکرہ، جدید تبدیلیاں اور کاموں کے پیش رفت کا ذکر بھی ہے، آپ حضرات کو اس رپورٹ میں اس حصہ کا بھی توقع ہونا چاہیئے، اس سلسلہ میں عرض ہے کہ ندوۃ العلماء کے ۸۵ سالہ جشن کا عمومی اثر ندوۃ العلماء اور دارالعلوم کے تمام شعبوں پر نمایاں اور محسوس طریقہ پر پڑا ہے، اور وہ ہر طرح سے خوشگوار اور مستوجب شکر و حمد ہے، ممالک عربیہ اور اسلامیہ میں اس کے تعارف و شہرت میں وہ بیش بہا اضافہ اور وسعت پیدا ہوئی ہے جو سالہا سال کی محنتوں، تبلیغ و اشاعت، اور تلقین و دعوت سے ممکن نہ تھی، اس کا اثر طلبہ کی تعداد کے اچانک اضافہ اور مالی امداد کی شکل میں ظاہر ہوا ہے، جس کی نظیر ندوۃ العلماء کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی، اسی بنا پر جلد نئے دارالاقامہ کی تعمیر کی ضرورت پیش آئی، جس کا کام اللہ کے بھروسہ پر ۲۱ مئی ۱۹۷۷ء کو شروع کر دیا گیا، اس نئے ہوسٹل کا نام ندوۃ العلماء کے ایک بنیادی خدمتگزار

> دینی مدارس، بے لوث، خدا ترس
> انسانیت دوست، درد آشنا،
> ایثار پیشہ، سخت کوش و جفاکش
> افراد پیدا کرتے ہیں۔

رکن و کارکن اور خدا کے ایک مخلص و خدا پرست بندے منشی اطہر علی صاحب مرحوم رئیس کاکوری کے نام پر "رواق اطہر" تجویز کیا گیا ہے، منشی صاحب کی اپنی دوسری دینی، روحانی و اخلاقی خصوصیات و کمالات کے علاوہ جن کی بنا پر وہ اس دور کے باخدا اور فقیر صفت لوگوں میں شمار کئے جانے کے قابل تھے، ایک خصوصیت یہ تھی کہ ان کو ندوۃ العلماء ہی کی خاطر اپنے وطن عزیز اور ہندوستان کو خیرباد کہنا پڑا، اور ان کے ذریعہ سے ندوۃ العلماء کا نام مدینہ طیبہ کی پاک سرزمین، اور ان کے انتقال کے بعد امید ہے کہ جنة البقيع کے آسودگان خاک کی محفل میں پہونچا، یہ رواق سہ منزلہ ہوگا، اور اس سے طلبہ کی روز افزوں تعداد کی رہائش کا مسئلہ کچھ عرصہ تک کے لئے حل ہو جائے گا، جن کی رہائش کے لئے اسوقت معقول انتظام نہیں ہے۔

اسی طرح سے اساتذہ و ملازمین کے کوارٹرس کی تعمیر کا کام بھی شروع کر دیا گیا ہے جس کے بغیر اساتذہ و ملازمین کو سخت دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا، اور ان میں سے متعدد دارالاقامہ کے حجروں میں مقیم ہیں، اور متعدد شہر میں قیام کی تکلیف اٹھا رہے ہیں، انشاء اللہ ان کی تعمیر سے بڑی حد تک اس کا بھی حل نکل آئے گا۔

دارالعلوم کے سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل ذکر تغیر اور ترقی مدرسہ ثانویہ کا نیا نظام اور اس کی وسعت و ترقی کا وہ نیا قدم ہے، جو اگرچہ گذشتہ سال اٹھایا گیا تھا، لیکن اس خاکہ پر اصل عمل اس سال سے شروع کیا گیا ہے، بعض انتظامی مصالح اور اس یکسانیت کی بنا پر جو ممالک عربیہ کی اصطلاحات کے فرق کا نتیجہ ہے اس کا نام اب "معہد دار العلوم" (الابتدائی والمتوسط) رکھ دیا گیا ہے، اور مدرسہ ثانویہ کو ترقی دینے کا، اور اس کو ثانویہ کی منزل تک دارالعلوم کے قدیم مضامین اور مروجہ نظام تعلیم نے جدید مضامین کے جامع بنانے کا تخیل ندوۃ العلماء کی اُس ۸۵ سالہ رپورٹ میں ظاہر کیا گیا تھا جو مہتمم صاحب دارالعلوم نے جشن میں پیش کی تھی، دارالعلوم میں اس توسیعی منصوبہ کے نفاذ میں جو ندوۃ العلماء کا اصل تخیل ہے متعدد قسم کی مشکلات حائل ہیں، اس لئے اس کی کوشش کی گئی کہ ثانویہ کو پہلے اس کا تجربہ گاہ بنایا جائے، جو طلبہ اس سے فارغ ہوں وہ اپنی اپنی مناسبت، رجحان، اور حالات کے مطابق اپنے لئے آئندہ تعلیم کا انتخاب کریں۔ دارالعلوم میں وہ طلبہ آئیں جو ضروری حد تک جدید معلومات سے واقف ہوگئے ہوں اور علوم اسلامیہ میں ترقی و اختصاص چاہتے ہوں، اور جو دوسری لائن اختیار کریں وہ دینیات، عربی زبان اور اسلامی اخلاق و سیرت سے اس حد تک آراستہ و مانوس ہو چکے ہوں کہ وہ اپنی خصوصیات برقرار رکھ سکیں، دین سے بنیادی واقفیت رکھتے ہوں، اور اسلامی سیرت کے ضروری تقاضوں کو پورا کرسکیں۔

اس سلسلہ میں اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں کہ جناب ریاض الدین احمد صاحب سابق پرنسپل مجیدیہ اسلامیہ کالج الٰہ آباد، اور اپنے قدیم رفیق مولوی نجم الدین صاحب قدوائی ندوی ایم۔ اے، بی۔ ایڈ کا شکریہ ادا کروں جنھوں نے اس کی منصوبہ بندی، نصاب و نظام کی ترتیب اور تعلیمی و انتظامی رہنمائی میں بیش قیمت مدد دی، نیز اس کے موجودہ ہیڈ ماسٹر مولوی حافظ ہارون رشید صدیقی ایم۔ اے کا بھی شکر گذار ہوں جنھوں نے بڑی تندہی، محنت اور دلی لگن کے ساتھ اس کی تنظیم و ترتیب کی خدمت انجام دی، اور اس کو ترقی کے راستہ پر ڈالا، اس کے اسٹاف میں خاصا اضافہ کرنا پڑا، اس سال طلبہ کی تعداد سالہائے ماسبق سے بہت زیادہ بنی، جب کہ طلبہ کی ایک بڑی تعداد کو لینے سے معذرت کر دی گئی، اس کے اقامت خانے اس کے لئے ناکافی ہو رہے ہیں عمارت میں بھی نمایاں طریقہ پر ترقی و توسیع ہوئی، اور اب وہ دارالعلوم کی ایک خوبصورت عمارت اور اس کا قابل لحاظ شعبہ اور ادارہ ہے، آپ حضرات اس کو ملاحظہ فرمائیں گے اور خوش ہوں گے۔

ایک خوش آئند و مبارک اضافہ شعبۂ حفظ کی توسیع و ترقی ہے، یہ شعبہ اس احساس کے ماتحت دارالعلوم میں چند سال پہلے کھولا گیا تھا، کہ قرآن مجید کے حفظ کے سلسلہ میں تشویشناک حد تک مسلمان خاندانوں میں غفلت و بے توجہی پیدا ہوگئی ہے، کیفیت کے علاوہ کمیت میں بھی روز افزوں انحطاط اور تنزل ہے، دینی کیفیت سے عام بے توجہی، قرآن مجید کی نعمت کی قدر و تعظیم میں انحطاط اور معاشی دباؤ نے حفاظ و قراء کی تعداد میں بہت فرق پیدا کر دیا ہے، یہ مسئلہ ہندوستان ہی کا نہیں، مرکز اسلام حرمین شریفین اور جزیرۃ العرب میں بھی جہاں قرآن مجید کا نزول ہوا، اہمیت اختیار کر گیا، یہاں تک کہ حکومت سعودیہ کو اس کی تشویق و ترغیب کے وسائل اختیار کرنا پڑے، اللہ تعالیٰ نے پاکستان کے ایک نومسلم صاحب توفیق حاجی یوسف صاحب سیٹھی مرحوم کو اس خدمت کے لئے انتخاب کیا، انہوں نے اس کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا، اور اپنے سرمایہ کا بڑا حصہ اس کے لئے

کسی ملک کی بڑائی کا معیار یہ نہیں کہ اس کا رقبہ بہت بڑا ہے، صحیح معیار یہ ہے کہ

اس ملک میں بڑے آدمی کتنے پائے جاتے ہیں

تقریر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بسلسلۂ رسم اجرائے کتاب "مولانا ابوالکلام آزاد احوال و آثار" زیر اہتمام مولانا آزاد میموریل اکیڈمی منعقدہ مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۷۹ء بمقام پرتبھا ہال لکھنؤ۔
اس جلسے میں مرکزی وزیر شری ایچ۔ این۔ بہوگنا، گورنر اتر پردیش شری تپاسے، ریاستی کابینہ کے وزیر مسٹر رام پرکاش اور مختلف ادبی و علمی شخصیتیں موجود تھیں۔

میں مولانا آزاد سے شخصی طور پر واقف ہونے کا شرف حاصل کر چکا ہوں اور مجھے ان سے ایک طرح کا نیازمندانہ لیکن دیرینہ اور عزیزانہ تعلق رہا ہے، میرا تعلق ان فضاؤں سے بھی رہا ہے، طالبعلمانہ ہی جن سے مولانا آزاد کو شغف تھا اور جن میں مولانا آزاد بڑے امتیاز اور اعزاز کا اور بعض چیزوں میں شرکت اور رہنمائی کا منصب رکھتے تھے، میرا اس دانشگاہ سے اور اس مکتب فکر سے بھی تعلق ہے اور مجھے اس کی خدمت کا شرف حاصل ہے جس سے مولانا کو قلبی تعلق تھا اور جہاں انہوں نے اپنی زندگی کے بڑے محبوب اور یادگار دن گذارے ہیں، میری مراد ندوۃ العلماء سے ہے، یہاں مولانا نے "الندوہ" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے شریک ادارت کی حیثیت سے اپنی زندگی کے ایسے دن گذارے ہیں جو اپنے رقبہ اور اپنی تعداد کے لحاظ سے تو بہت زیادہ نہیں ہیں لیکن اپنے جوہر کے لحاظ سے اپنی قیمت کے لحاظ سے اور زندگی کے اس عہد سے تعلق رکھنے کی وجہ سے جو ہر شخص کو عزیز ہوتا ہے، مولانا کی نگاہ میں بھی بہت عزیز تھے، وقیع تھے اور جن کو انہوں نے کبھی فراموش نہیں کیا۔

حضرات! کسی ملک کی بڑائی کا معیار یہ نہیں ہے کہ اس ملک کا رقبہ بہت بڑا ہے یا اس ملک کی آبادی بہت زیادہ ہے، ملک کی بڑائی کا صحیح معیار یہ ہے کہ اس ملک میں بڑے آدمی کتنے پائے جاتے ہیں یا اس ملک نے کتنے بڑے آدمیوں کو جنم دیا، پھر بڑے آدمیوں کا بھی معیار یہ نہیں ہے کہ وہ بہت دولتمند ہیں یا بڑے اختیارات کے مالک ہیں، بڑے منصب پر فائز ہیں، یہ سب چیزیں بھی خدا کی دین ہیں اور وہ بڑائی کی علامتیں ہیں لیکن بڑائی کا حقیقی معیار یہ ہے کہ اس کا دماغ کتنا بڑا ہے، اس کا کیرکٹر کتنا پختہ ہے، اگر کوئی ملک ایسے بڑے آدمیوں کی کوئی بڑی تعداد پیش نہیں کر سکتا تو جغرافیائی حیثیت سے بلکہ میں یہاں تک کہنے پر تیار ہوں کہ سیاسی حیثیت سے بھی، اقتصادی حیثیت سے بھی، سیاسی نقشہ میں اور اقوام متحدہ میں بھی اس کا کتنا ہی مقام ہو لیکن تاریخ میں، انسانی فکر کی تاریخ میں اور انسانیت کے حقیقی میدان میں اس ملک کی بڑائی کچھ زیادہ تسلیم نہیں کی جائے گی اور وہ ملک کوئی ایسا نقش دوام نہیں چھوڑے گا دنیا کے صحیفہ پر، دنیا کی تاریخ پر کہ جو صدیوں تک باقی رہے، ہمیں فخر ہے کہ ہمارے ملک نے گذشتہ زمانہ میں بھی خاصی تعداد میں ایسے بڑے آدمی پیدا کئے، اور اس زمانہ میں بھی جب انگریزوں کا اقتدار اس ملک میں پورے طور پر قائم ہو گیا تھا اور یہ ملک عام طور پر زندگی کے تمام میدانوں میں بڑے آزمائشی دور سے گذر رہا تھا جسے قحط الرجال کہتے ہیں وہ قحط الرجال کا شکار تھا انسانیت کا جو حقیقی میدان ہے اس میں بھی اس ملک کو بڑھنے پھیلنے، پھولنے، اپنی صلاحیت کو ظاہر کرنے کے مواقع بہت کم تھے اور اس کو برابر اس سے محروم کیا جاتا رہا تھا، اس نے اس عہد میں بھی ایسے بڑے آدمی پیدا کئے جنھوں نے بڑا نام پیدا کیا اور صرف بڑا نام نہیں پیدا کیا بلکہ بڑا کام کیا، بڑا کام انجام دیا اور اس ملک ہی کی تاریخ میں نہیں بلکہ فکر انسانی کی تاریخ میں اور علم انسانی کی تاریخ میں جو کسی ملک کا کوئی محدود سرمایہ نہیں ہے، کسی ملک کا اس پر اجارہ نہیں ہے بلکہ وہ انسانیت کی دولت مشترکہ ہے اگر یہ تعبیر صحیح ہو، دولت مشترکہ کے لفظ سے ذرا شبہ ہوتا ہے کچھ ڈر بھی معلوم ہوتا ہے کہ کہیں اس کو کامن ویلتھ کے مرادف نہ سمجھا جائے لیکن انسانیت کی ایک دولت مشترکہ ہے جس پر انسانیت کو ہر وقت فخر کرنے کا اور اس پر اپنا حق ثابت کرنے کا حق ہے اور یہ حق اس سے چھینا نہیں جا سکتا، وہ دور بڑا منحوس ہوگا انسانیت کے حق میں وہ بڑا تاریک دور ہوگا جب انسانیت سے انسانی اقوام سے، جماعتوں سے یہ حق چھین لیا جائے کہ وہ کسی بڑے آدمی پر، کسی انسانی فرد پر جو نسل انسانی نے پیدا کیا ہو جس نے زندگی کی خدمت کے کسی میدان میں اپنی بڑائی ثابت کی ہو اس پر فخر کریں کا اس کو حق نہیں ہے، وہ دن دنیا کی تاریخ میں بڑا نامبارک ہوگا۔

میں نہیں سمجھتا کہ دنیا کا کوئی اقتدار اعلیٰ بھی انسانیت سے یا کسی انسانی نسل سے یہ حق چھین سکتا ہے، ہمارے ملک کو فخر ہے کہ اس نے ایک ایسے زمانہ میں جو عام طور پر انسانیت کے انحطاط کا زمانہ تھا اور جب ہندوستان کو اپنی ذہانت ثابت کرنے کے لئے، خودداری کے ثابت کرنے کے لئے اپنی خوداعتمادی کے ثابت کرنے کے لئے اپنے حقائق پر یقین، غیر متزلزل یقین کو ثابت کرنے کے لئے بڑی بڑی دشواریاں پیش تھیں اور کبھی اس کو دار و رسن کی منزلوں سے گذرنا پڑتا تھا، کبھی مصائب و محن کی منزل سے گذرنا پڑتا تھا اس زمانہ میں ہمارے ملک کی سطح سے کچھ ایسے لوگ ابھرے کہ جو وہ یکہ تھے، ملک ہی تھے اور جنھوں نے اپنی بڑائی کا نقش ثابت کر دیا۔

مولانا آزاد اس لئے بڑے نہیں ہیں کہ انہوں نے بڑی شہرت حاصل کی، انہوں نے جنگ آزادی کی رہنمائی کی (اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے اور ہم سب اس کے احسانمند رہیں گے) بلکہ وہ اس لئے بڑے ہیں کہ انہوں نے اپنی بڑائی کو منوالیا، مخالفوں سے بھی منوالیا اور اپنے ہمنواؤں سے منوایا، انہوں نے اپنی ذہنی بڑائی کو، اپنی دماغی بڑائی کو بھی تسلیم کروالیا اپنی قادر الکلامی سے اور نہ صرف اپنی تحریر کی روانی اور اپنے قلم کی جولانی سے بلکہ اپنی فکری صلاحیت سے انہوں نے ثابت کر دیا کہ ان کا دماغ عام سطح سے بہت اونچا ہے اور خدا نے ان کو ذہانت کا ایک ایسا جوہر عطا فرمایا ہے، معاملہ فہمی کا کسی مسئلہ کی تہہ تک پہونچ جانے کا اور سب سے بڑھ کر دماغی توازن کا جو ایک بہت بڑی نعمت ہوتی ہے اور ذہانت سے زیادہ وہ کارآمد ہوتی ہے انسانیت کی تعمیر میں اور علوم و افکار کی تحقیق اور ان کو آگے بڑھانے کے کام میں دماغی توازن کی، اصابت رائے کی ضرورت ہے اور صحیح طریقہ پر دماغ سے کام لینے کی ضرورت ہے جذبات کی رو میں آدمی بہہ نہ جائے اور جس چیز کا جو تناسب قدرت نے مقرر کر دیا ہے اسی تناسب کے ساتھ اس کے ساتھ معاملہ کرے اس لحاظ سے مولانا آزاد نے اپنی بڑائی کا اور اپنی عظمت کا نقش قائم کر دیا اور ہمارے لئے اور ہم آپ سب کے لئے یہ بڑے فخر و مسرت کا مقام ہے کہ ان کی یہ صلاحیت ضائع نہیں ہوئی بلکہ ہندوستان کے اسی آزمائش کے دور میں بھی اس سے پورا فائدہ اٹھایا گیا اور گاندھی جی جیسے ایک معمولی شہرت ملک نے ان کی اس قابلیت کو اور ان کی اس خصوصیت کو تسلیم کیا۔

پھر دوسری بڑی خصوصیت ان کی یہ ہے کہ انہوں نے اپنا سودا نہیں کیا، وہ دنیا کی اس نیلام کی منڈی میں بہت بڑے دام اپنے لگوا سکتے تھے اور یہ دنیا جو علم و فن کی دنیا ہے، جو علمی تحقیقات کی دنیا ہے، جو تعریف کی دنیا ہے، جو آزمائشوں کی دنیا ہے یہ آسانی کے ساتھ نیلام کی منڈی بھی بن جاتی ہے، ہم نے دیکھا ہے کہ مجبوری کی بنا پر یا اور دوسرے معلوم اور نامعلوم اسباب کی بنا پر بڑے بڑے انسان بھی نیلام کی اس منڈی میں آ جاتے ہیں اور وہ اپنا سودا کرتے ہیں، وہ لوگوں کو موقع دیتے ہیں کہ ان کی بولی بولی جائے، مولانا آزاد اگر اپنی قیمت وصول کرنا چاہتے، اپنی حکومت سے یا اس وقت کے اس معاشرہ سے اس معاشرہ سے کہ جو ان کا کلمہ پڑھ سکتی تھی ان کے پیچھے پروانوں کی طرح، شمع کے پروانوں کی طرح ان پر نچھاور ہو سکتی تھی، خدا نے انکو خطابت کا جوہر دیا تھا اور ایسا جوہر دیا تھا میں اپنی محدود معلومات کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں ہندوستان کے باہر شاید دنیا کے کسی ملک نے ایسے آتش نوا اور ایسے شعلہ بیان اور ایسے آتش بیان خطیب کم پیدا کئے ہوں، یہ میں اس سے نہیں کہتا ہوں کہ مجھے اس مبارک تقریب میں اس معزز تقریب میں شرکت کے لئے اور آپ کو خوش

وقف کر دیا ان کی دلسوزی اور سعی جمیل سے حجاز، دبئی اور اسی کے بعد افریقہ میں تحفیظ قرآن کے مدارس اور جماعتوں کا ایک جال بچھ گیا، اور ہماری معلومات کی حد تک سر دست ان ممالک سے یہ خطرہ ٹل گیا ہے کہ حفظ قرآن کا رواج جاتا رہے۔

ہمارے شہر لکھنؤ کو مدت دراز سے یہ فخر رہا ہے کہ یہاں خدا کے ایک مخلص بندہ اور عالم ربانی حضرت مولانا عین القضاۃ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سعی سے حفظ و تجوید کا ایک اہم مرکز "مدرسہ فرقانیہ" کے نام سے قائم ہوا جس کے فیوض ہندوستان کے حدود سے متجاوز ہو کر کابل و بخارا اور حجاز تک پہونچے لیکن انقلاب زمانہ سے وہ مدرسہ بھی محفوظ نہیں رہا، اور اس کو اپنے کام کو محدود کرنا پڑا، ایسے موقع پر دار العلوم میں شعبہ حفظ کا قیام وقت کی ایک بڑی ضرورت کی تکمیل، اور ندوۃ العلماء اور اس کے کارکنوں کے لئے سعادت کی بات تھی، یہ شعبہ آٹھ، دس طالبعلموں سے شروع ہوا تھا لیکن اب خدا کے فضل سے اس میں ایک سو تیس طالب علم ہیں۔ ابھی دو ہفتے پہلے مسجد دار العلوم میں ۲۱ طلبہ کے حفظ قرآن کی تکمیل کے سلسلے میں جلسہ ہوا، کمیت ہی نہیں بلکہ کیفیت کے لحاظ سے بھی اس شعبہ نے خاصا اعتماد اور نیک نامی حاصل کی ہے، اور اس کی طرف رجوع بڑھتا جا رہا ہے، اب اس کی وسعت، ضروریات اور روزافزوں طلب اس کی متقاضی ہے کہ اس کو ایک مستقل اکائی کے طور پر دار العلوم میں ترقی دی جائے، الحمدللہ کہ ندوۃ العلماء کے کارکنوں نے طے کر لیا ہے کہ مدرسہ تحفیظ القرآن کے نام سے دار العلوم میں ایک مستقل عمارت کی بنیاد رکھی جائے اس کا نقشہ بھی بن گیا ہے، اس میں حفظ و تجوید کی تعلیم کے معقول انتظامات کئے جائیں گے، تجوید کو بھی ایک فن کی طرح پڑھایا جائے گا اور اس کے لئے ماہرین فن کی خدمات حاصل کی جائیں گی۔ امید ہے کہ ہمارے اس اقدام سے بانیان ندوۃ العلماء اور اس کے مرحوم خدمت گذاروں اور کارکنوں کی روح خوش ہوگی، اور خدمت قرآن کے نورانی صحیفہ میں بھی دار العلوم اور اس کے خدمت گذاروں کا نام لکھا جائے گا۔

قبل اس کے کہ میں اس رپورٹ کو ختم کروں ندوۃ العلماء کے دو عربی ترجمانوں ماہنامہ "البعث الاسلامی" اور پندرہ روزہ "الرائد" کا مسرت اور انکی خدمات کے اعتراف کے ساتھ ذکر ضروری سمجھتا ہوں ان دو رسالوں نے نہ صرف ندوۃ العلماء کا نام عالم عربی میں روشن کیا بلکہ دینی و دعوتی ذہن کی رقت کے فتنوں کے مقابلے اور صحیح اسلامی فکر کی اشاعت، اور عربوں کو ان کا منصب و مقام یاد دلانے میں نہایت قابل قدر کردار ادا کیا ہے، اور اس صدق مقال اور اصول پسندی کا نتیجہ ہے کہ ان کو مشرق وسطیٰ کے اسلامی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اور ان کو اسلامی عربی صحافت کی صف اول میں جگہ دی جاتی ہے، ندوۃ العلماء نے شروع سے عربی زبان کے ایک زندہ زبان کی طرح خاص کرنے اور اس کی تحریر و تقریر میں مہارت پیدا کرنے پر زور اسی لئے دیا تھا کہ اسکے فرزند عربی زبان کو اپنے اظہار خیال اور دعوت و تبلیغ کا ذریعہ بنا سکیں اور جن لوگوں کی مادری زبان عربی ہے اور وہ زبان و ادب کا ذوق رکھتے ہیں، وہ ان کی تحریروں اور خیالات کو غور و توجہ اور قدر و وقعت کی نگاہ سے دیکھ سکیں اور رسائل میں، الحمدللہ کہ یہ خواب اب ان رسائل اور ان فضلاء کے ذریعہ پورا ہو رہا ہے جو عالم عربی میں تقریری یا تحریری طور پر دعوت کا کام انجام دے رہے ہیں۔

آخر میں میں اپنے رفقاء کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جن کے سر حقیقتاً ان تمام ترقیات کا سہرا ہے، اور جن کی شب و روز کی سرگرمیوں، ہمہ وقت فکر و سعی، انتھک محنت، باوقار مشوروں، وسیع تجربہ اور تعاون و اشتراک عمل کی وجہ سے اور جذبہ سے ندوۃ العلماء اور دار العلوم ترقی کی ان منزلوں تک پہونچ رہا ہے، جنکا خواب ہمارے ربانی و حقانی بانیان ندوۃ العلماء اور اس کے مخلص کارکنوں نے شروع میں دیکھا تھا، مجھے ان کا نام بھی زبان پر لاتے ہوئے حجاب سا محسوس ہوتا ہے اور اس میں اس میں غیرت کی بو اور تکلف کا شائبہ محسوس کرتا ہوں۔

وقل اعملوا فسیری اللہ عملکم و رسولہ والمؤمنون و ستردون الی عالم الغیب والشہادۃ فینبئکم بما کنتم تعملون ۵

ابوالحسن علی
(ناظم ندوۃ العلماء)

منی آرڈر کوپن پر اپنا پتہ صاف اور مکمل تحریر کریں تاکہ تعمیل میں آسانی ہو۔
"منیجر"

ندوۃ العلماء کے جلسۂ انتظامیہ میں دیوبند کے جشن صد سالہ کے لئے نیک خواہشات کا اظہار

ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کو یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ دار العلوم دیوبند کا جشن صد سالہ امسال نومبر میں منعقد ہو رہا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس عالمگیر اجتماع سے صرف علمی و دینی ہی نہیں بلکہ ہر پہلو سے ملک و ملت کو غیر معمولی فوائد پہونچیں گے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے اندر اس سے نشاط کار اور دلولۂ عمل پیدا ہوگا، دین کے صحیح خطوط نمایاں ہوں گے، غلط عقائد و افکار سے ذہن پاک ہوں گے اور کتاب و سنت کی دلآویز تعلیمات کو فروغ ہوگا، عالم اسلام کے ساتھ روابط مستحکم ہوں گے اور اس سے ملت اسلامی کی تقویت کے علاوہ ملک کو بھی بیش از بیش فوائد حاصل ہوں گے۔

دار العلوم دیوبند اور اس کے اکابر کے ساتھ ندوۃ العلماء کے ہمیشہ سے مخلصانہ روابط رہے ہیں کہ دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں، اس بنا پر اس جشن مسرت پر یہ مجلس بہت مسرور ہے، اور دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کو اپنے تعاون کا یقین دلاتی ہے اور اللہ تبارک و تعالیٰ سے اس اجلاس کی کامیابی کی دعا کرتی ہے۔

ندوہ کے شب و روز

محمد نعیم صدیقی ندوی ایم۔ اے

گذشتہ ماہ کی ۲۵ تاریخ کو ندوہ کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ تھا اس میں شرکت کے لئے ہندوستان کے اکابر اہل علم اور ممتاز عمائد بڑی تعداد میں تشریف لائے۔ طلبہ دار العلوم ایسے زریں مواقع کو ہمیشہ نعمت غیر مترقبہ خیال کرتے ہیں، چنانچہ حسب معمول انجمن الاصلاح کے ذمہ داروں نے مولانا سعید احمد اکبرآبادی مدیر ماہنامہ "برہان" اور مفتی عتیق الرحمن صاحب ناظم ندوۃ المصنفین دہلی سے اپنے قیمتی تجربات و نصائح سے مستفید کرنے کی درخواست کی، چنانچہ اسی دن ۶ بجے شب میں انجمن کے وسیع جمالیہ ہال میں حضرت مفتی صاحب موصوف کی صدارت میں ایک جلسہ کا انعقاد ہوا جس میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کے علاوہ باہر سے تشریف لائے ہوئے دوسرے اہل علم اور دار العلوم کے اساتذہ کرام بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ ناظم الاصلاح نے ان دونوں اکابر کا مختصر مگر جامع تعارف کرایا، پھر مولانا اکبرآبادی نے تقریباً ایک گھنٹہ نہایت مفید معلومات افزا اور بصیرت افروز تقریر کی جسکا حاصل یہ تھا کہ طالبان علوم نبوت اپنے حقیقی منصب و مقام کی معرفت حاصل کریں اور ہر طرح کے احساس کمتری سے بلند ہو کر اپنے اندر خوداعتمادی اور عقابی قوت پرواز کریں۔ ندوہ نے حضرت مولانا علی میاں کے عہد میں مختلف میدانوں میں جو حیرت انگیز ترقی کی ہے، فاضل موصوف نے بڑے موثر انداز میں اس کو بیان کرتے ہوئے طلبہ دار العلوم کو تلقین کی کہ وہ اس قیمتی موقع سے بیش از بیش فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں اس کے بعد مفتی صاحب نے اپنے مختصر صدارتی خطاب میں طلبہ کو اپنے اندر کمال و اختصاص پیدا کرنے کی اہمیت پر زور دیا ——— ۲۶ دسمبر کو معہد ابتدائی و متوسط دار العلوم (مدرسہ ثانویہ) میں "یوم والدین" منایا گیا جسمیں طلبہ کے سرپرستوں کا بڑا پر اثر اور دلکش اجتماع منعقد ہوا، مولانا منت اللہ رحمانی ندوی امیر شریعت بہار و اڑیسہ نے جلسہ کی صدارت کی، جناب نجم الدین شکیب ندوی، ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی اور ہارون رشید صاحب نے طلبہ کے سرپرستوں کے سامنے دار العلوم کے اس نئے ادارہ کے قیام کی اہمیت و ضرورت اور خدمات کا جائزہ پیش کیا، پھر صدر جلسہ مولانا منت اللہ رحمانی نے اپنی تقریر میں بچوں کی ابتدائی تعلیم کے عصری اداروں کے دوررس نقصانات واضح کرتے ہوئے مدرسہ ثانویہ کے قیام اور اس کے حسن نظم و تربیت کو سراہا۔ آخر میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے نہایت شرح و بسط کے ساتھ طلبہ کے سرپرستوں کو اپنے سینوں میں اولاد کے لئے سوز آرزو کے چراغ روشن رکھنے کی تلقین کی ——— ۲۸ دسمبر کی سہ پہر کو حضرت مولانا علی میاں صاحب رابطہ عالم اسلامی کی میٹنگ میں شرکت کیلئے حجاز تشریف لیگئے ہیں، رفیق سفر کی حیثیت سے مولانا محمد رابع صاحب ندوی استاذ دار العلوم حضرت مولانا کے ہمراہ ہیں، ناظرین تعمیر حیات سے درخواست ہے کہ وہ مولانا کی بصحت و عافیت واپسی کی دعا فرمائیں اواخر جنوری تک ہندوستان واپسی کی توقع ہے ——— طلبائے ندوہ کے درمیان جمالیہ ہال میں کلام اقبال میں محدود بیت بازی کا مقابلہ ہوا۔ یہ دلچسپ مقابلہ دو گھنٹے تک جاری رہا، جیتنے والی ٹیم کو ٹرافی انعام میں دی جائیگی۔ انفرادی نمایاں انعامات کے مستحق علی الترتیب ظہیر احمد، ساجد اور عبدالوحید قرار پائے۔ تقسیم انعامات کا جلسہ حضرت مولانا مدظلہ کی سفر حجاز سے واپسی کے بعد منعقد ہوگا۔

کرنے کے لئے کچھ کہنا ہے بلکہ ایک شہادت کے طور پر، ایک گواہی کے طور پر کہتا ہوں جیسا کہ اشارہ کیا گیا، مجھے ہندوستان کے باہر جانے کا اتفاق ہوا ہے دوسرے ملک دیکھے ہیں اور مجھے ان ملکوں کی ادبیات سے بھی دلچسپی رہی ہے، میں نے وہاں کے مقرروں کو سنا ہے، وہاں کی علمی مجلسوں میں میں نے ان کو سنا ہے اور عدالت کے کمروں میں میں نے ان کو سنا ہے، میں نے ان کو سیاسی رزم گاہوں میں بھی دیکھا اور سنا ہے، میں اپنی اس واقفیت کی بناء پر فخر نہیں کرتا لیکن شہادت کی مضبوطی اور اس کے استحکام کے لئے عرض کر رہا ہوں، اگر کہا جائے کہ ہمارے اس دور نے اس بیسویں صدی نے اور اس بیسویں صدی کے اس نصف اول نے دنیا کے کسی ملک نے ایسے خطیب پیدا نہیں کئے یا یہ کہئے کہ خاصی تعداد میں، کسی قابل ذکر تعداد میں پیدا نہیں کئے جو مولانا آزاد کے ہم پلہ ہو سکیں، وہ شخص آگ لگا سکتا تھا، وہ شخص قوموں کو کم سے کم ہندوستان کی پبلک کو وہ اپنے پیچھے دیوانوں کی طرح دوڑا سکتا تھا، وہ جس طرح ایک سیلاب آتا ہے اور بڑی بڑی چٹانوں کو بہائے جاتا ہے وہ سیلاب اتنا طاقتور اور اتنا طوفانی تھا کہ بڑی چٹانوں کو بہا لیجا سکتا تھا مولانا آزاد کی یہ ایک بہت بڑی قابل تعریف خصوصیت ہے جو کبھی ان کے حالات میں اسکو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے کبھی اس کا غلط استعمال نہیں کیا وہ پورے ہندوستان کو اپنا مسحور کر سکتے تھے، الہلال کے سحر حلال کو تو اب تک لوگ نہیں بھولے ہونگے آج بھی اس کی سطروں میں وہ جادو ہے کہ آج بھی آپ اگر اس کو پڑھیں، آپ کو زبان کا ذوق ہو اور آپ کچھ اس کا لطف لینا جانتے ہوں تو آپ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اس شخص کے لئے کیا مشکل بات تھی کہ ہمارے ہندوستان پر جادو کر دیتا اپنی زبان کا اور پھر اس سے جو فائدہ حاصل کر سکتا تھا وہ کرتا، مولانا آزاد نے اسکی بالکل پرواہ نہیں کی وہ عقیدہ کے آدمی تھے، وہ مسلک کے آدمی تھے، وہ اصول کے آدمی تھے وہ جیسا کہ انہوں نے کہا کسی سیاہ کپڑے کو کوئی پہن لے تو اسے سفید نہیں کہا جاسکتا، اور اگر سفید کو کوئی سیاہ پوش یا کوئی سیاہ فام یا کوئی سیاہ فکر آدمی اس کو استعمال کرے اس سے فائدہ اٹھائے تو اسے سیاہ نہیں کہا جاسکتا، وہ حقائق پر یقین رکھتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ یہ انسان خدا کی امانت ہیں، مقدس امانت ہیں، ہمارا ملک اس لئے نہیں ہے کہ جہنم زار بن جائے، اس لئے نہیں ہے کہ یہاں آدمی، آدمی کے خون کا پیاسا ہو، یہ گاہکوں کا ملک نہیں ہے کہ یہاں ہر ایک خریدار ہے، ہر ایک گاہک ہے، یہ ملک خریداروں اور گاہکوں کا نہیں ہے، خدا کی بستی کوئی دوکان نہیں ہے ان کا اس پر یقین تھا یہ کوئی قمار خانہ نہیں ہے یہاں جو پانسہ ڈالدے، جو پھینکدے کوئی چیز کوئی نقدی تو اس کو جیت لے اور اس جوئے خانہ سے زیادہ سے فائدہ لے کے نکلے، خدا نے اسکو اس لئے بنایا ہے کہ یہ بنے اور سنورے اور پھلے پھولے۔ ہم پر اس ملک کا حق ہے انسانوں کو انہوں نے کبھی بچہ تسلیم نہیں کیا کہ ان کو بہلانا اور پھسلانا چاہیئے، ان کو اپنی خوشنوائی سے اور اپنی داستان سرائی سے پھسلانا چاہیئے، انہوں نے اپنی قوم مسلمانوں کو میں صاف کہتا ہوں مجھے یہ کہنے کا حق ہے کہ میں اس قوم کے ایک فرد کی حیثیت سے میں اس کی حقیقت سے واقف ہوں انہوں نے اپنی قوم سے کوئی خراج تحسین حاصل کرنے اور ان کا محبوب لیڈر رہنے کی کبھی قیمت ادا نہیں کی، انہوں نے کبھی یہ سودا نہیں کیا کہ مسلمان مجھے اپنے سر پر بٹھا لیں اور اپنی آنکھوں میں جگہ دیں میں انکی خواہش اور ان کی منشاء کے مطابق بات کہوں، انہوں نے کبھی اس کی پرواہ نہیں کی اپنی زندگی کے کسی دور میں اس کی پرواہ نہیں کی لوگ کیا کہتے ہیں، انہوں نے یہ دیکھا کہ ان کا خدا ان سے کیا کہتا ہے، خدا کی کتاب آسمانی ان سے کیا کہتی ہے جس کی انہوں نے خدمت کی اور اس کی خدمت میں بھی انہوں نے بہت بڑا امتیاز حاصل کیا۔

مولانا آزاد اس لئے بڑے نہیں کہ انہوں نے بڑی شہرت حاصل کی، بلکہ وہ اس لئے بڑے ہیں کہ انہوں نے اپنی بڑائی کو مخالفوں سے بھی منوالیا اور ہمنواؤں سے بھی منوالیا

تو مولانا آزاد کے دو جوہر تھے ایک جوہر تو ایسا تھا کہ جو غیر اختیاری تھا، اور ایک جوہر وہ تھا جو اختیاری تھا میں اسکو زیادہ اہمیت دیتا ہوں، غیر اختیاری جوہر تو یہ تھا کہ خدا نے ان کو ذہین پیدا کیا، وہ جب پیدا ہوئے تو ذہین پیدا ہوئے وہ جینیس تھے، اگر ہمارے ملک میں دو چار آدمیوں کی ایسی فہرست پوری احتیاط سے بنائی جائے جن پر جینیس کا لفظ صحیح طور پر صادق آتا ہے، اس لفظ کے استعمال میں بہت فیاضی سے کام لیا گیا ہے اور بہت بے احتیاطی کی گئی ہے میں سمجھتا ہوں اگر مختصر سے مختصر فہرست بنائی جائے اس کروڑوں آدمیوں کے ملک میں جینیس انسانوں کی تو میں پورے اعتماد و وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ مولانا آزاد کی جگہ اس میں محفوظ رہیگی، یہ تو غیر اختیاری چیز تھی، یہ تو خدا کی ایک نوازش تھی، اس کی دین تھی کہ اس نے ان کو ایسا اونچا دماغ دیا تھا جو نیچا ہو نہیں سکتا تھا وہ اگر چاہتے بھی کہ نیچی سطح پر اتر آئیں تو وہ اتر نہیں سکتے تھے، ان کا دماغ اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا جس طرح کسی بڑی چیز کو آپ چھوٹی چیز میں محدود نہیں کر سکتے، خدا نے ان کو جو دماغ دیا تھا وہ کسی چھوٹے دائرہ میں محدود نہیں رہ سکتا تھا اور اس کو نیچی سطح پر لایا نہیں جاسکتا تھا، یہ بھی خدا کی بہت بڑی رحمت تھی اور ان کی بہت بڑی خصوصیت تھی لیکن اسمیں ان کے اختیار کو دخل نہیں تھا وہ تو ایسے ہی پیدا ہوئے تھے ان کو تو دماغ ہی ایسا ملا تھا جو چیز ہمارے اور آپ کے خاص طور پر یاد رکھنے اور سبق لینے کی ہے وہ یہ کہ ایک اور ان میں جوہر تھا اور وہ یہ تھا کہ وہ ایک کیرکٹر کے انسان تھے انہوں نے اپنی زندگی کا ایک مقصد معین کر لیا، ان کو خدا کی مرضی کے مطابق کام کرنا ہے اپنے مذہب کی ہدایات کے مطابق کام کرنا ہے، ان کا جن صداقتوں پر، ایقین کی زبان میں بولتا ہوں جن سچائیوں پر ان کا یقین جم گیا تھا ان سچائیوں کو پیش کرنا ہے ان کو اس سے مطلب نہیں کہ لوگ خوش ہوتے ہیں یا ناخوش ہوتے ہیں، مجھے اس موقع پر بلا ارادہ ان کی ایک تحریر کا ایک حصہ یاد آگیا غالباً انہوں نے کئی جگہ اس کا حوالہ دیا ہے کہ گیلیلو نے جب یہ دعویٰ کیا کہ زمین آفتاب کے گرد گردش کرتی ہے تو انہوں نے یہ واقعہ لکھا ہے اور گویا حدیث دیگراں میں سر دلبراں بیان کیا ہے اپنی آپ بیتی دوسروں کی زبان میں سنائی ہے جب وہ تحقیقی عدالت میں پیش کیا گیا جو کلیسا نے قائم کر دی تھی تو اس کو بتایا گیا کہ اگر تم نے زمین کے مسطح ہونے اور یہ کہ سورج اس کے گرد گردش کرتا ہے اگر تم نے قبول نہیں کیا جو عیسائی عقیدہ ہے، حالانکہ یہ عیسائی عقیدہ نہ تھا میں مذہب کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے وثوق سے کہتا ہوں کہ یہ نہ عیسائیت کا عقیدہ ہے اور نہ اسلام کا عقیدہ ہے اور نہ کسی مذہب کا عقیدہ نہیں یہ مذہب کا موضوع نہیں ہے لیکن اہل کلیسا کو اس پر اصرار تھا مقدس بائیبل، مقدس جاگرافی، بائیبل کا مقدس جغرافیہ ہے ان لوگوں نے اپنی تفسیر میں لکھا تھا کہ یہ اس کا جز ہے اس کو عدالت میں لایا گیا اور اس کو بتایا گیا کہ اگر اس نے اس بات کا اقرار نہیں کیا کہ زمین مسطح ہے چپٹی ہے اور سورج اس کے گرد گردش کرتا ہے تو اس کو زندہ جلا دیا جائے گا، مولانا آزاد نے لکھا ہے وہ سہم گیا اور اس نے اقرار کر لیا، لیکن اس کے بعد جب وہ عدالت سے نکلا تو اس نے کہا کہ میں تو اب بھی دیکھ رہا ہوں کہ زمین سورج کے گرد گردش کر رہی ہے میں اپنے اس مشاہدہ کو کیا کروں اس کو پھر عدالت میں لایا گیا اور اس کو وہ سزا دی گئی جو کلیسا نے اس کے لئے تجویز کی تھی مولانا آزاد نے قرون وسطیٰ کے ایک دانشور اور قرون وسطیٰ کے ایک محقق کی کہانی سنائی ہے، لیکن ساری عمر ان کا اسی کہانی پر عمل رہا اسی کہانی کی اسپرٹ پر، اسی کہانی کے جوہر پر ان کا عمل رہا انہوں نے کبھی اس کی پرواہ نہیں کی کہ ان کے ہم مذہب کیا کہتے ہیں کیا رائے قائم کرتے ہیں اور ان کے ہم وطن ان کے بارے میں کیا رائے قائم کرتے ہیں، ہم کو اور آپ کو ہمیشہ اس بات کے آگے سر جھکا دینا پڑے گا، ان کی اس بڑائی کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان کی ساری عمر صحیح بات کہنے اور اسی پر اصرار کرنے میں گذری اس کی ان کو وہ قیمت برداشت کرنی پڑی جو ایسے سب حق پسندوں کو ادا کرنی پڑی ہے، وہ اس سے بڑے آدمی ہو سکتے تھے اور جہاں تک زندگی کی آسائشوں کا تعلق ہے اسمیں تو کوئی شبہ نہیں کہ ان کو زندگی کی وہ بڑی سے بڑی آسائشیں حاصل ہو سکتی تھیں جو کسی محبوب لیڈر کو یا کسی مذہبی پیشوا کو حاصل ہو سکتی تھیں، لیکن انہوں نے اس کی کبھی پرواہ نہیں کی، وہ خواہ مذہبی عقائد ہوں خواہ سیاسی خیالات ہوں، سیاسی عقائد ہوں انہوں نے جس چیز کو صحیح سمجھا ہمیشہ بانگ دہل اس چیز کا اعلان کیا اس کی بالکل پرواہ نہیں کی کہ اس کا نتیجہ اسکا رد عمل کیا ہوگا، ہم جب اس موقع پر یہاں موجود ہیں تو

مولانا آزاد کی قابل تعریف خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ذہانت، اور صلاحیت کا کبھی غلط استعمال نہیں کیا اور دنیا کی منڈی میں اس کے دام نہیں لگوائے۔

ہمارا فرض صرف اتنا ہی نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم مولانا آزاد کو خراج تحسین پیش کریں، نذرانۂ عقیدت پیش کریں، اب وہ تو اس عالم میں ہیں کہ ان کو وہاں ہمارے نذرانۂ عقیدت کی کوئی ضرورت نہیں اور جہاں اب ان کی نفسی کیا خدمت اور خدا کے ساتھ جو ان کا تعلق تھا، جو ان کا عقیدۂ توحید تھا اور جو ان کے اخلاق تھے، ان کا کردار تھا یہ انکے مقام کو بلند کرنے کے لئے کافی ہے، ہم جیسے یہاں جمع ہوئے ہیں اور خوش قسمتی سے کم سے کم ہماری ریاست اور اس سے زیادہ خوش قسمتی ہے کہ ریاست کے باہر مرکز کے ایسے باوقار اور ایسے صاحب کردار نمایندے موجود ہیں تو ہم کو مولانا آزاد کے تذکرہ میں اس پہلو کو کبھی نہیں بھولنا چاہیئے، آج ہمارے ملک کو سب سے زیادہ ان انسانوں کی ضرورت ہے جو کسی صداقت پر کسی سچائی پر اڑ جائیں اور وہ اس کی بالکل پرواہ نہ کریں، الیکشن تو بالکل ادنیٰ درجہ کی چیز ہے میں معذرت چاہتا ہوں، میں معافی چاہتا ہوں لیکن کہتا ہوں کہ الیکشن تو بالکل ابتدائی چیز ہے الیکشن سے بدرجہا زیادہ بلند چیزوں کی وہ پرواہ نہیں کرتے اور سب سے زیادہ انھیں جو انعام ملتا ہے ان کا سب سے بڑا انعام یہ ہے کہ ان کا ضمیر مطمئن ہو اور اس سے بڑا انعام یہ ہے کہ ان کا پیدا کرنے والا ان سے راضی اور خوش ہو۔

ہمارے ملک کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مولانا آزاد ایسے جو قیادت کا بانکپن ہوں، جن کے اندر وہ حوصلہ مندی ہو، جن کے اندر پہاڑوں کی سی استقامت اور مضبوطی ہو، جن کے اندر دریا کی سی بے نیازی اور بے پروائی ہو، جن کے اندر روشنی کی سی فیاضی اور فراخدلی ہو، ایسے لوگوں کی ضرورت ہے ہمارے ملک کو کہ،

اگر ملک کوئی غلط راہ اختیار کرتا ہے، میں نہیں کہتا کہ وہ غلط رخ کیا ہے، یہ زندہ انسانوں کا ملک ہے، یہ غور کرنے والوں، ان لوگوں ان انسانوں کا ملک ہے جو اپنے اندر خواہشات بھی رکھتے ہیں اپنے اندر ترقی کی ہوس اور ترقی کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں، ہو سکتا ہے یہاں کچھ ایسی چیزیں جن میں ہمارے لئے کشش اور دلربائی ہے اگر کوئی ایسی چیز آجائے، اگر اس ملک کی کشتی اس بھنور سے نکال سکتا ہے تو صرف وہ لوگ نکال سکتے وہ سر پھیر سلاح نکال سکتے ہیں جو طوفانوں سے لڑیں ہمارے یہاں ہوا و ہوس کا، فرقہ پرستی کا، انسان دشمنی کا حقائق فراموشی کا ایک طوفان میں نہیں کہتا لیکن ایک چنگاری ہے جو سلگ رہی ہے اور اندیشہ ہے کہ اس خرمن کو کہیں جلا کر خاک سیاہ نہ کر دے، آج ہم کو ایسے انسانوں کی ضرورت ہے جو اڑ کر کھڑے ہو جائیں اور کہیں کہ چاہے جان جائے اور چاہے دنیا کی ساری آسائشوں سے ہم کو ہاتھ دھونا پڑے لیکن ہم اپنے ملک کو غلط راستہ پر، غلط رخ پر پڑا ہوا نہیں دیکھ سکتے مولانا آزاد اس لئے بڑے نہیں تھے کہ وہ بہت ذہین تھے، بڑی اچھی تقریر کرتے تھے اور تحریک آزادی میں انہوں نے نمایاں حصہ لیا بلکہ وہ اس لئے بڑے تھے کہ انہوں نے اس کا مظاہرہ کیا، وہ بالکل اپنے ہم مذہبوں کے جذبات کی بھی اور ہم وطنوں کے جذبات کی آندھی اور طوفان کے ساتھ چلنے کے لئے تیار نہیں تھے اور انہوں نے اپنی پوری زندگی میں اسی کا ثبوت دیا اور اسی کا نقش وہ اپنی تحریروں اور کتابوں میں چھوڑ گئے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مولانا آزاد کی نسبت سے یہ تقریب ہو رہی ہے، ہم ایک مرتبہ پھر اس سبق کو دہرائیں اور اپنے دل میں اس بات کا عہد کریں کہ ہمیں اس ملک کو ان تمام خطروں سے بچانا ہے جو سامنے آرہے ہیں، یہ ملک جیسا کہ مولانا آزاد نے ایک جگہ لکھا ہے ؎

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوق اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے

ان کا یہ عقیدہ تھا کہ یہ ملک مختلف پھولوں کا گلدستہ ہے مختلف تہذیبوں کا، مختلف تقاضوں کا، مختلف ثقافتوں کا، مختلف کلچروں کا ایک مرکز ہے اور اس کی خوبی اور اس کا حسن اس میں ہے کہ یہ پھول سب رہیں اور کسی کو باغ سے محبت کا دعویٰ نہیں ہو سکتا کہ ایک پھول کو برداشت کرے اور دوسرے پھول کو برداشت نہ کرے، جس کو خدا نے ذوقِ جمال عطا کیا ہے، جس کو خدا نے چمن سے محبت عطا کی ہے اس کو تو وہاں کا تنکا بھی عزیز ہے اس کو تو وہاں کا کانٹا بھی عزیز ہے، لیکن کانٹے تو کانٹے پھولوں کو چمن سے جدا کر دینا نہ ذوقِ جمال کی دلیل ہے اور نہ حب الوطنی کی دلیل ہے، اس لئے جب آپ مولانا آزاد کا نام لیتے ہیں تو آپ ان کے اس پیغام کو بھی یاد رکھیں، اس کو زندہ رکھیں کہ انہوں نے اس ملک کا جو تصور دیا تھا۔

ان کے ذہن میں اس ملک کی جو تصویر تھی وہ کیا تھی؟ وہ یہ تھی کہ یہ مختلف پھولوں کا چمن ہے، یہ ایک پھول کا نہیں ہے یہ کسی ایک رنگ کے پھول کا صرف نہیں ہے یہ کسی اور پھول کا نہیں ہے اس میں گلاب بھی ہے، اس میں بیلا بھی ہے اس میں چنبیلی بھی ہے اس میں نسترن بھی ہے اس لئے ہم کو اگر اسی چمن سے محبت ہے ہم کو خدا نے ذوق جمال، ہم کو پھول کی رعنائی و زیبائی کا کوئی تصور دیا ہے تو ہم اس کے سب پھولوں کو اپنے سینہ سے لگائیں گے، اپنی آنکھوں سے لگائیں گے، اور اگر کوئی ان پھولوں میں سے کسی پھول کی طرف بری نگاہ سے دیکھے گا تو ہم اسکے دشمن ہوں گے، اگر ہم نے مولانا آزاد کے اس پیغام کو یاد نہیں رکھا تو میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں ان کی روح کے آگے شرمندہ ہونا پڑے گا، وہ آپ سے اس بات کے بالکل طالب نہیں کہ آپ ان کے ادب کو خراج تحسین پیش کریں، بے نیاز ادیب اپنے ادب کا ٹیکس وصول کر لیتا ہے، کوئی چاہے نہ چاہے لیکن اچھا شعر پڑھا جائیگا تو سب مجبور ہیں کہ اس کی داد دیں، مولانا آزاد ادب کے اس مقام پر تھے کہ آج ان کو ہمارے ادیبوں سے میں ان تحقیقی مقالوں کی تحقیر نہیں کرتا اور ناقدری نہیں کرتا لیکن مولانا آزاد اب اس منزل سے گذر چکے، وہ تو ہمارے ادب کا ایک جز بن گئے ان کو اب اس سے خارج نہیں کیا جاسکتا، مولانا آزاد کو اس کی ضرورت نہیں کہ ہم ان کو ایک صاحب اسلوب ادیب مانیں، ان کو اس کی ضرورت نہیں کہ ہم ان کو ایک بڑے عالم دین کی حیثیت سے تسلیم کریں، ان کا لوہا مصر و شام بھی مانتے ہیں، ان کو اس کی ضرورت ہے اگر ان کی روح کی پکار ہے ان کی روح کا کوئی پیغام ہے اور میں کیا کروں کہ میرے کان اندر سے سن رہے ہیں کہ اس ملک کو خطرہ سے بچاؤ، اس ملک کو فسطائیت سے اور جارحیت سے بچاؤ، انسان دشمنی سے، طوفان سے اس ملک کو بچاؤ، علم دشمنی سے، حقیقت دشمنی سے، حسن دشمنی سے کمال دشمنی سے بچاؤ، یہ اس ملک کے لئے حقیقی خطرہ ہے، اگر یہ خطرہ نہیں ٹلتا تو ہمیں پھر ضرورت ہے ایک آزاد نہیں چار اور سو آزاد پیدا ہوں۔

حضرات! میں ان الفاظ کے ساتھ رسم اجراء کی اس خدمت کو انجام دیتا ہوں اور میں اسے اپنے لئے بڑے فخر کی بات سمجھتا ہوں کہ میں کل جب چند سال قبل مولانا آزاد سے ملنے میں فخر محسوس کرتا تھا ایک عزیز، عزیز خاندان کی حیثیت سے وہ مجھ سے محبت کرتے تھے میں اسوقت بالکل نہیں سمجھتا تھا کہ کبھی اس قابل ہوں گا کہ ان کی زندگی کے بعد ایسی سنجیدہ اور باوقار مجلس میں شریک ہوں اور ایک ایسی کتاب کی رسم اجراء انجام دوں جس کا انتساب ان کی ذات گرامی اور ان کی بلند پایہ ذات سے ہے، میں ان لوگوں کا بھی شکر گذار ہوں جنھوں نے اس اہم خدمت کے لئے میرا انتخاب کیا اور آپ کا بھی شکر گذار ہوں جنھوں نے پوری دلچسپی اور ہمدردی کے ساتھ اور میں جہاں تک سمجھتا ہوں، کانوں کی رفاقت کے ساتھ کانوں کی رفاقت نہیں، دل کی رفاقت کے ساتھ میری یہ حقیر گذارشیں سنیں۔!!

پرنٹر پبلشر مسئول سید محمد حسنی نے جے۔ کے آفسیٹ پرنٹنگ پریس میں طبع کرا کر دفتر "تعمیر حیات" ندوہ لکھنؤ سے شائع کیا۔
اڈیٹر: اسحٰق جلیس ندوی

دار العلوم ندوۃ العلماء کے اردو ترجمان "تعمیر حیات" کا مطالعہ کیجئے اور اس کی توسیع اشاعت میں حصہ لیجئے۔
"منیجر"

ملک کو مولانا آزاد کی ضرورت ہے

(مرکزی وزیر بہوگنا)

جناب صدر محترم علی میاں ندوی صاحب، عزت مآب گورنر صاحب، جناب رام پرکاش صاحب خواتین اور حاضرین!

میں مولانا ابوالکلام آزاد اکیڈمی کا انتہائی ممنون اور مشکور ہوں کہ انہوں نے مجھے موقع دیا کہ آج ایک لمبے قد کے انسان کے سلسلے سے جس نے ہمارے ہندوستان کی سرزمین کو اپنی بک کلامی ہی سے نہیں بلکہ کاموں سے بھی نوازا ہے اس کی یاد کے سلسلے سے ایک دوسرے بہت لمبے قد کے انسان ایک دوسری ہستی ایک بہت وسیع دل و دماغ کے انسان، ایک بڑے بزرگ، جن کی موجودگی آج ہندوستان کے لئے باعث راحت ہے جن کے خیالات سننے کا اور انکی مبارک زبان سے اس بڑے انسان کے سلسلے سے براہ راست گھر جانے کا اور ہندوستان کے آجکے حالات پر اور اس کی تصویر میں رنگ بھرنے کے سلسلے پر جن لوگوں پر جو ذمہ داری عائد ہے، ان کو چند کلمہ خیر ہی نہیں بلکہ مفصل تشریح بھی سننے کا جو موقع دیا ہے اس کے لئے میں اس اکیڈمی کے کارکنوں اور انتظامیہ کمیٹی کا بہت بہت شکرگذار ہوں علی میاں صاحب ندوی کی مبارک زبان سے ان کے مقدس خیالات سے ہم سب کو زبردست فائدہ ہوا ہے۔

ان کی ذات سے اس ملک کو اس قوم کو دنیا میں جگہ ملی ہے جیسے مولانا آزاد کی ذات اور شخصیت سے ہندوستان روشن ہوا تھا۔ مولانا علی میاں صاحب کی ذات سے آج روشن ہے، میں بہترین موقع سمجھتا ہوں کہ چاند اور ستاروں کی یاد چاند اور ستارے تو کر رہے ہیں مولانا علی میاں صاحب کی زبان سے مولانا آزاد کی بات سننے سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

مولانا آزاد کو ہم نے پاس سے دیکھا — ان کا حسن اخلاق، ان کا فکر و تدبر، اس وقت میری گرفت سے باہر چیز تھی، لیکن ان میں ایک عجیب کشش تھی، آواز میں جادو تھا، بولتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ کوئی جھنجھوڑ ڈال رہا ہے، کوئی پکار رہا ہے، مُردے کھڑے ہو جاتے زندگی نہیں بچاری ہے بہت آگے جاتا ہے بہت دور جاتا ہے، تھکنے کا کام نہیں چلتے جاتا ہے۔ ایک شاندار انسان جس کو اپنے اوپر بھروسہ تھا اس قوم کی قسمت پر بھروسہ تھا آنے والے زمانے میں بھروسہ تھا، مولانا علی میاں صاحب نے ابھی کہا، مولانا آزاد مرحوم وہ انسان نہیں ہیں جو ایک قوم، ایک ملک کی حد پر باندھے جاسکتے ہیں وہ انسان کی سوغات انسانیت کے لئے تھے، انسانیت کو فروغ دینے کے لئے مولانا آزاد نے جنگ آزادی میں حصہ لیا، اسی لئے میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اسلام نے آزادی کا پرچم اٹھایا اور غلام انسانوں کو آزاد کرنے کے لئے اسلام وجود میں آیا تھا، چاہے خیالوں کی غلامی ہو چاہے کسی خاص قسم کے دور کی غلامی ہو اس سے باہر نکلنے کے لئے اس سے بے چین اور زار زار انسانوں کی نئی دنیا بنانے کے لئے اگر اسلام نے پکارا ہے انسانیت کو، تو اسلام کا ماننے والا غلام بن کر رہے یہ ممکن نہیں تھا، اس لئے ۱۸۵۷ء کے وقت ۵۷ کی بغاوت جس کو میں غدر نہیں کہتا ۱۸۵۷ء کی بغاوت رہی ہو یا سارے جنگ آزادی کی کہانی جب تک ہم آزاد نہیں ہوئے اور اس کا ایک حصہ آج بھی باقی ہے کہ جنگ آزادی راج بدل کی لڑائی نہیں تھی بلکہ سارے سماجی حالات کو بدلنا، ہماری کیفیت کو بدلنے کی لڑائی تھی وہ آج بھی جاری ہے اس لڑائی کے کچھ پہلوؤں کی طرف علی میاں صاحب کی زبان سے ہم نے سنا، میں اس کو دہرانا نہیں چاہتا لیکن خطرے موجود ہیں اور ان خطروں کو ہم آپ کو سب کو برابر یاد رکھنا ہے تو اس جنگ آزادی کی جو صورت اور کوشش و جد وجہد کی جو صورت باقی ہے، اس میں آج بھی ہماری آپ کی سب کی شرکت مولانا کے لئے بہترین خراج عقیدت بن سکتی ہے، مولانا کی یاد لکھنؤ میں انہی کاموں سے کرنی ہے، ان کی یاد انہی کاموں پر چل کر ہو سکتی ہے ان کے خیالات کے ساتھ جڑ کر ہو سکتی ہے مولانا کی یاد جیسا کہ ابھی علی میاں صاحب نے کہا کہ اس ملک کی اصل صورت پہچاننے کی ضرورت ہے، یہ ملک جس میں بہت طرح کے لوگ ہیں۔ یہ ملک دریاؤں کا نہیں، یہ ملک پہاڑوں کا نہیں، یہ ملک انسانوں کا ملک ہے ... انسان اس ملک میں طرح طرح سے سوچتے رہے ہیں طرح طرح گزرتے رہے ہیں، طرح طرح کے طریقوں سے ڈھلتے چڑھتے اور آگے بڑھتے رہے ہیں۔ ہم ہمیشہ مل جل کر آگے بڑھتے رہے گنگا جمنا کے دھاروں کی طرح بلا کسی کو دبائے ہوئے ایک دوسرے کا ساتھ دیکر برابر آگے بڑھنے کی کوشش ہم نے کی ہے، ہمارا تمدن خوبصورتی ہماری بھاشا ہماری زبان ملی جلی چیز ہے، میں بہت سے بھائیوں سے کہتا ہوں کہ زبان کے نام سے جھگڑا کرنے ہو اچھا نہیں لگتا کیونکہ اگر پوچھا جائے کہ ہندوستان کی سب سے پہلی زبان کون ہے، تو پھر کون زبان نکلے گی؟ وہ نکلے گی جس کو آج ہم کوئی بھی نہیں جانتے، "پراکرت پالی" نکلے گی، لیکن زبان کا دریا ایسا بہتا رہا ہے اور اس طرح آتا اور جاتا رہا ہے ایک زبان نہیں رہی اور آج بھی ہمارے دیش میں کئی زبانیں ہیں مولانا آزاد کے سلسلے سے اُردو کی بات آئی ہے، اردو ہندوستان کی ادبی دنیا کا زبانوں کا سنگم ہے، چاہے عربی چاہے فارسی چاہے ہندوستان کی زبانوں کو ملاکر دیکھئے ترکی زبانوں کے الفاظ اس میں ملتے چلے آجاتے ہیں اور یہی ایک زبان ہے جس کا جنم ہندوستان کے اندر ہوا۔ اُردو لکھنؤ کی تہذیب اور اتر پردیش سے خاص رشتہ رکھتی ہے ابھی آپ نے کہا کہ سرکار اردو اکیڈمی کو کم کرے یا زیادہ کرے،

اسلام نے انسانیت کو ہر قسم کی غلامی سے نجات دی۔

میں ان لوگوں میں سے ہوں جو برابر اور مسلسل لوگوں سے کہہ رہا ہے، اور ان لوگوں سے کہہ رہا ہے جو اردو سے کچھ ڈرتے ہیں کہ اُردو سے جتنا ڈرو گے اُردو اتنی ہی لمبی ہوتی جائیگی۔

اس کی بیماری یہی ہے اور پہچان اسکی یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد جتنا ہم نے اردو سے ہٹ کر دوسری طرف جانے کی کوشش کی ہم نے دیکھا کہ اُردو اتنی ہی زیادہ پھیلی ہے اسکے رسالے اتنے ہی نکلے ہیں، اس کے اخبارات اتنے ہی زیادہ نکلے ہیں، اس کی کتابیں اتنی ہی نکلی ہیں جتنا ۱۹۴۷ء سے پہلے نہیں نکلتے تھے۔ آپ دیکھیے چاہے قلم کوئی ہوں، کسی کا قلم ٹھہر جائے، کسی کا ٹھہر جائے کسی کا تھم جائے لیکن اُردو نہ تھمتی ہے نہ رکتی ہے وہ تو چلتی ہی چلتی ہے اسی میں ہمت ہے اسی میں زندگی ہے،

میرا ذہن بالکل صاف ہے سرکار کے دفتروں میں اس میں کام ہونا چاہیے اور سرکاری زبان بننی چاہیے۔

اور اگر سرکار کہتی ہے کہ دو زبان کیسے ہوگی؟ تو سوئٹزرلینڈ کو لے لیجئے، اتنا چھوٹا ملک اور ایک سے زیادہ زبانیں رائج ہیں۔

اُردو کو مٹانے کے معنی ہیں کہ لمبی تاریخ سے ناطہ توڑنا ہے، میں آج آپ سے کہتا ہوں میں آجکل "تیلی" ہوں تیلی کے ناطے سے تعلق پڑتا ہے عرب ممالک سے اور جب وہ بات کرتے ہیں عربی میں یا فارسی میں تو میں الفاظ پکڑ لیتا ہوں میں نے مذاق کیا وہاں کے دوستوں سے میں نے کہا کہ میاں ہم تو وہ ہیں جو عربی کی فارسی سے شادی کراتے ہیں اور بچہ پیدا ہو جائے اُردو، کہنے لگے کیا مطلب؟ میں نے کہا نعرہ لگاتے ہیں "انقلاب زندہ باد" عربی بھی موجود اور فارسی میں موجود اور زبان و نعرہ ہمارا، یہ عربی اور فارسی سے جن کا تعلق نہیں ان کا بھی نعرہ ہے جو اُردو سے ہٹ کر دور رہنا چاہتے ہیں ان کا بھی نعرہ ہے، جو اردو پسند لوگ ہیں ان کا بھی نعرہ ہے، جو قوم کو بنانا چاہتے ہیں ان کا بھی نعرہ ہے، جو برباد کرنا چاہتے ہیں ان کا بھی نعرہ ہے، میرا ذہن بالکل صاف ہے اور میرا صاف کہنا ہے کہ یہ کیا اُردو کے معاملے میں کہ زیادہ بولنے والوں کو راضی کر لو تو ہم تمہاری بات مان لینگے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جو کم تعداد میں ہے اس کی بات نہیں مانی جائے گی۔؟

جمہوریت کے اصلی معنی یہ ہیں کہ جنکی تعداد کم ہے ان کا بھروسہ جمہوریت کے سلسلے سے موجود کو ہے کہ نہیں ہے؟ اقلیت اگر ساتھ نہیں ہے تو اکثریت کے ساتھ رہنے کوئی معنی نہیں،

جب میں یہاں چند دنوں بدقسمتی سے چیف منسٹر رہا تو ایک صاحب نے اسمبلی میں کہا کہ جب سے آپ آئے ہیں اُردو بہت بولی جانے لگی ہے انہوں نے سوچا کہ وہ کچھ میرے خلاف بول رہے ہیں۔ تو میں جب بھی کوئی کام کرتا ہوں کسی سے پوچھ کر کرتا نہیں۔ میں جب وزیر اعلیٰ بنا تھا میں نے کہا تھا کہ اردو کو اس کی جگہ دینی پڑے گی،

اُردو کو دوسری سرکاری زبان بننا چاہیے

(بہوگنا)

اس کے لئے ہم کام کریں گے۔

ایک صاحب نے کہا تھا کہ ہمیں اردو سے کوئی جھگڑا نہیں اردو کو ہم مانیں گے دیوناگری میں اردو لکھنا شروع کردو" میں نے جواب دیا کہ آپ اگر اردو کو کہتے ہیں کہ اپنی لکھاوٹ بدل دو تو ایک کام کیجئے اردو والوں کے مشورے کے بغیر، مولانا علی میاں کے بلا اجازت کے ان کی اجازت کے بغیر میں کام نہیں کرتا، کچھ غلطیاں جو کرتا ہوں وہ اپنے من سے کرتا ہوں لیکن اچھے کاموں کے سلسلے میں ان کو بتاتا رہتا ہوں کہ اگر کچھ اجازت ان کی ہو تو کیا جائے پھر اس میں کچھ غلطیاں بھی کم ہو جاتی ہیں ویسے میں ان کی اجازت کے بغیر اکثر کام نہیں کرتا، جواب یہ تھا کہ بنگالی کی، مراٹھی کی، گجراتی کی، ملیالم کی، تیلگو کی لکھاوٹ پہلے ناگری کر دیجئے اردو والوں کی طرف سے میں ناگری لکھاوٹ کر دونگا۔

دو دن پہلے تامل ناڈ میں تھا ان کو اپنی زبان، ثقافت و تہذیب پر ناز ہے۔ بات صحیح ہے، ہندوستان کی کسی زبان میں افسانے چھوٹی کہانیاں نہیں تھیں، وہ تامل ناڈو والوں نے لکھیں اس سے پہلے کسی نے لکھی نہیں تھی اب ان کو گھمنڈ ہے کہ ہمارا ادب اتنا پرانا ہے آپ کیسے اس کو ختم کر دیجئے گا، وہ کہتے ہیں کہ میاں تم لکھتے ہو تو ایسی ایسی لکیریں بنتی ہیں جیسے ڈنڈے بنتے ہیں ہم لکھتے ہیں تو پھول بنتے ہیں، اگر غور کیجئے کوئی لکھے تو پھول بنیں کوئی لکھے تو ڈنڈے بنیں۔ آپ ان کہہ دیجئے کہ تم پھول چھوڑ دو اور ڈنڈا پکڑو، تو یہ سب جھگڑے غلط جھگڑے ہیں،

اُردو کو مولانا آزاد جیسے لوگوں نے نوازا ہے، مجھے توقع ہے کہ یہ اکیڈمی کچھ کام کرے گی مولانا آزاد کی ذات ہر مشکل گھڑی میں ہمارا سہارا بن سکتی ہے، جیسا کہ آج جناب محترم علی میاں صاحب نے اپنی باتوں سے نوازا، ہمارا پورا خیال ہے کہ مولانا آزاد مرحوم ہٹ دھرم نہیں تھے لیکن اپنی باتوں کے دھنی تھے اپنی بات پر اٹل رہنے والے انسان تھے۔

مولانا آزاد جینئس انسان تھے جیسا مولانا علی میاں صاحب نے کہا ان کی آواز پرکشش تھی، ان کا دماغ اعلیٰ درجے کا تھا، مجھے یاد ہے کہ ان کی تقریروں کا جادو سر پر چڑھ کے بولتا تھا، ان کی بات میں ایک وزن تھا سروجنی نائیڈو اگر ہیں اور مولانا اردو میں تقریر کرتے تو معلوم ہوتا تھا کہ شاعری ہو رہی ہے، جیسا کہ ابھی مولانا علی میاں صاحب نے کہا میں ڈر رہا تھا کہ ان کے بعد میں جاہل آدمی کیا کہوں گا؟ کام تو سب ختم ہو گیا ہے لیکن پھر سمجھ میں آیا کہ بہت اونچے انسان کے بعد اگر کوئی چھوٹا انسان کھڑا ہو جائے تو بھی لوگ سنتے ہیں کہ یہ کیا بولتا ہے ورنہ بات بگڑ جاتی ہے۔

مولانا آزاد اپنی بات پر اٹل رہنے والے انسان تھے، اس ملک کی تہذیب و تمدن، اس ملک کی شرافت کا پورا مجسمہ اور نمایاں شخص تھے، ان کی یاد میں تازگی پیدا ہوگی اور جب پیر لڑکھڑائیں گے تو ہمیں سہارا ملے گا — اور مجھے بھروسہ ہے کہ اکیڈمی کام کرے گی، پیسے کی بابت ایک بات کہہ کر میں ختم کر دوں گا، آپ نے پیسے کی بات ایسے انسان کے سامنے کی ہے جو ہمارے سامنے بیٹھے ہیں بار بار ان کا ذکر کرنا پڑتا ہے۔ میں نے کیا غلطی کی کہ ایک مرتبہ ندوۃ العلماء گیا اور میں نے دیکھا کہ ندوے میں لائبریری میں ہزاروں کتابوں کا ذخیرہ ہے، یہ ذخیرہ ہمارے ہندوستان بلکہ انسانیت کو اجاگر کرنے والا ہے،

میرے دل میں آیا کہ اگر ہر سال اس کے لئے کچھ پیسے دے جائیں تو اچھا ہوگا میں نے بجٹ میں رکھا کہ ایک لاکھ روپیہ سالانہ ندوہ لائبریری کو دیا جائے، جب یہ بجٹ پاس ہو گیا تو میں نے محکمہ تعلیم میں وہ خبر بھیج دی اور مولانا کو خط لکھا، مولانا کا جوابی خط میری زندگی کی سب سے بڑی چیز ہے۔ وزارت اعلیٰ سے استعفا دینے کے بعد وہ خط میں نے فائل میں نہیں چھوڑا بلکہ ساتھ لیتے آیا اس وقت میں منتری رام پرشاد جی کو بتا رہا ہوں کہ وہ پکڑ نہ لیں مجھ کو، اس خط میں مولانا نے مجھ کو لکھا لیکن انکار کا بھی کیا انداز ہے اور کیا اونچائی ہے کہا کہ "بھئی تمہاری محبت کا تو بہت شکریہ لیکن میری عادت خراب نہ کرو، تم رقم دے رہے ہو اس کے معنی یہ ہیں کہ ندوہ اپنے پیروں اور ایمان پر کھڑا نہیں رہے گا سرکار کے سہارے کھڑا رہیگا" میری لمبی زندگی میں، کوئی دوسری ایسی جماعت، کوئی دوسرا ایسا ادارہ اور کوئی دوسرا ایسا انسان نہیں ملا جس نے چلے ہوئے پیسے کو کہا ہو کہ آپ خدا کے لئے واپس لے جائیے، ہمیں نہیں چاہیے، میں حیرت میں آگیا، ایمان کی بات بتا رہا ہوں کہ مولانا نے یہ کیا کیا؟ یہی نہیں جب ندوہ میں بڑا جلسہ ہوا اور جس جلسے کا دنیا میں بڑا چرچا ہوا اس جلسے کے لئے میں پیچھے پڑ گیا کہ مولانا کچھ تو کرنے دیجئے کچھ تو کرنے دیجئے وہ ہر بات میں "نا" کہتے رہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو "نا" کے سوائے کوئی لفظ آتا ہی نہیں۔

یہ بات بہت اونچی ہے میں اکیڈمی والوں سے بھی کہنا چاہتا ہوں کہ انسان جب اپنے پیروں پہ کھڑا ہوتا ہے تو دنیا کو چھلانگ کر چلا جاتا ہے اور رکتا نہیں ہے۔ ندوۃ العلماء کی مجسم شکل آپ کے سامنے بیٹھی ہوئی ہے — انہوں نے "نا" کیا باوجود اس کے کہ کچھ لوگ بہت ناراض ہوئے، اور جب ناراض ہوئے تو مجھ سے پوچھا گیا کہ وہ ناراض کیوں ہیں۔؟ تو میں یہ شعر پیش کیا ؎

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے

میرا کہنا یہ ہے کہ مولانا نے یہاں بیٹھ کر آپ کو اور ہم کو یہ بتایا ہے کہ بہت سے کام کرنا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اکیڈمی کام کرے گی۔

مجھے پورا بھروسہ ہے کہ اگر یہ مقدس جماعت اپنے پیروں پر کھڑی رہے گی اور وہ اپنے خیالوں پہ اٹل رہے گی تو سرکار بھی مدد کرے گی، انسان بھی مدد کرے گا اور ملک بھی مدد کرے گا۔

قوم کو مولانا آزاد کی یاد کی بہت سخت ضرورت ہے اور جب میں قوم کہتا ہوں تو سارے ہندوستان کے سلسلے میں کہتا ہوں، میں دھرم کو اور قوم کو نہیں جوڑتا، ملک کو مولانا آزاد کی یاد کی ضرورت ہے، ان کے بتائے ہوئے طریقے کی ضرورت ہے،

مجھے امید ہے کہ ان کے راستے پر ہم چل سکیں گے اور وہی ان کے لئے سب سے بڑی یادگار ہوگی۔

طوفان زدگان کی امداد کیجئے!

ہمارے ملک کی جنوبی ریاستوں آندھرا پردیش، تامل ناڈو اور کیرالہ کو حالیہ سمندری طوفانوں سے جو زبردست جانی اور مالی نقصان ہوا ہے اس سے ہر شخص باخبر ہے۔ اس تباہی اور مصیبت کا شکار ہونے والے لوگ ملک کے تمام شہریوں اور عالم انسانیت کے تمام افراد کی ہمدردی، اعانت اور تعاون کے مستحق ہیں — بنی نوع انسان کی مصیبت، دکھ، درد اور تکلیف کا احساس اس سے ہمدردی اور مدد کا جذبہ وہ صفات ہیں جن کی ہمارے ملک اور پوری دنیائے انسانیت کو ضرورت ہے۔

میری اپیل ہے کہ بلاتفریق مذہب و ملت طوفان زدگان کی امداد اور باز آبادکاری کی خدمت میں بھرپور تعاون کرکے خدا کی خوشنودی حاصل کریں اور انسانی اخلاق و ہمدردی کی اعلیٰ روایات کو فروغ دیں۔

(مولانا) سید ابوالحسن علی ندوی

جانتے گر ثواب طاعت و زہد....

عبد اللہ حسنی ندوی

حضرت مولانا محمد احمد صاحب کی مجلس علوم و معارف کا خزانہ، محبت و شوق اور تعلق باللہ کا ایک موثر ذریعہ ہے اور وہ ایک ایسا صاف و شفاف آئینہ ہیں جس میں ہر شخص اپنی بگڑی ہوئی صورت اور ہر فرد اپنے چہرہ دیکھی کو دیکھ سکتا ہے، اور اپنی زندگی کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے راستہ اور آپ کی دی ہوئی تعلیمات کے مطابق بنا سکتا ہے، جو لوگ ایسی پاک صحبتوں سے دور ہیں یا ان کو اس کا موقع نہیں ملتا اور ایسے حضرات کی خدمت میں حاضری نہیں دے سکتے ان کے لئے ان حضرات کے کلمات بھی ایک قیمتی سوغات ہیں۔ اگرچہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ" انسان کے ہر عضو کا مستقل کام ہے، کان دل و نظر کا کام نہیں کر سکتے۔

فرمایا! جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سردار انبیاء اور ان کے امام ہیں اسی طرح یہ امت بھی تمام امتوں میں افضل و بہتر ہے، مگر کیا ہے؟ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنھون عن المنکر الخ فاروق اعظم ارشاد فرماتے ہیں اگر تم خیرامت میں داخل ہونا چاہتے ہو تو اس شرط کو پورا کرو۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم اسلام کے سانچے میں ڈھلے نہیں، جو لوگ اسلام سے متنفر ہیں، ہم شکایت کیوں کرتے ہیں، ہر خود اپنے کو دیکھیں ہم نے اپنے کو اسلام کے سانچے میں ڈھالا نہیں، جب ایمان کامل ہوتا ہے، نظر اللہ کی طرف ہوتی ہے اور اللہ کا حق ادا کیا جاتا ہے تو نہ مال حق بات کہنے سے روک سکتا ہے، نہ جاہ روک سکتی ہے اور نہ ہی اس پر کسی جابر کا زور چل سکتا ہے۔

ہم خود درست ہوں اور اپنی اصلاح کریں، معروف میں ہم فانی اور منکرات سے متنفر ہوں، جس شخص کے اندر یہ چیزیں پیدا ہو جائیں میں قسم کھاتا ہوں کہ دنیا اس کی طرف جھکے گی اور اگر ساری دنیا یہ کرنے تو کیا سے کیا ہو جائے ہم خود مجرم ہیں اسلامی تعلیمات کو بھلا کر اپنے کو بگاڑ رکھا ہے۔

اسلام کی حقانیت عمل سے نمایاں ہوگی اور اسلامی تعلیمات کی برتری و فوقیت اسی وقت ظاہر ہوگی جب ہمارے اندر عمل کا جذبہ ہوگا اور ہماری زندگی اس کی شاہد ہوگی کہ یہ ہیں مسلمان، یہ ہیں فرمانبردار، یہ ہیں اللہ کے محبوب کے ماننے والے، پہلے کیا ہوتا تھا اگر خبر کین و کفار کو امانت رکھانی ہوتی تو حضور کے پاس رکھواتے، کیونکہ ان کو یقین تھا کہ مسلمان امانت میں خیانت نہیں جانتا "والذین ھم لاماناتھم وعھدھم راعون"

فرمایا! مال کی بھی امانت ہے اور بات کی بھی امانت ہے۔ مال کی امانت یہ ہے کہ جو چیز ہم کو دی جائے ویسے ہی اس کو واپس کر دیں۔ ورنہ ہم اجازت لے لیں کہ ہم اس کو تصرف میں لا سکتے ہیں، اسی طرح بات کی بھی امانت ہے کہ اگر کسی نے ہم سے کوئی بات کہی تو یہ امانت ہے کہ ہم کسی سے نہ کہیں اور اس کے راز کو فاش نہ کریں، مگر جس کے دو زبان ہیں کہ جب آپ کے پاس جائے تو آپ کی سی بات کرے اور دوسری طرف جائے تو ویسی بات کرے وہ امین نہیں، اخلاق حمیدہ، اخلاق حسنہ سے ہم عاری و خالی ہیں اور رذائل میں مبتلا ہیں،

فرمایا! بزرگوں کے پاس اسی لئے جایا جاتا ہے کہ ان کے فیوض و برکات سے رذائل دور ہوں اور نفس کی اصلاح ہو،

فرمایا! رذائل کا ازالہ نہیں ہوتا بلکہ امالہ ہوتا ہے، اگر رذائل فنا ہو جائیں تو مجاہدہ کیوں ہو، ایک شخص اندھا ہو کہ یہ کہے کہ میں نامحرم کو نہیں دیکھتا، تو بھی کیا کمال ہے،

ایک شخص بدنگاہی میں مبتلا تھا اس نے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رح کو لکھا کہ میں بدنگاہی میں مبتلا ہوں، حضرت نے لکھا کہ طبیعت کو روکو اور آنکھ مت اٹھاؤ اللہ نے اختیار دیا ہے اس سے کام لو، اس نے لکھا حضرت بہت کوشش کی مگر نظر اٹھ ہی جاتی ہے تو حضرت نے لکھا کیوں جھوٹ بولتے ہو نگاہ اٹھ نہیں جاتی بلکہ تم اٹھاتے ہو۔

فرمایا! پہلی نظر معاف ہے۔ اب طبیعت کے اندر تقاضا پیدا ہوا اور دیکھا تو یہ آنکھ کا زنا ہے بزرگوں نے لکھا ہے لوگ تسبیح پڑھ لیں گے، نماز پڑھ لیں گے لیکن ان امراض میں جو مبتلا ہیں ان کا کیا ہوگا، حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ فرماتے کہ لوگوں کا کیا حال ہے کہ ہماری مجلس میں آتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے زنا ٹپکتا ہوتا ہے۔

فرمایا! اللہ والوں کو وہ فراست و نظر عطا ہوتی ہے کہ وہ بھانپ لیتے ہیں، حضرت شاہ عبد القادر صاحب رح مسجد میں درس دیا کرتے تھے، ایک طالب علم لاابالی تھا اس کو غسل کی حاجت ہو گئی اسی حالت میں وہ مسجد کی طرف روانہ ہو گیا، حضرت نے دیکھا کہ بغل میں کتاب دبائے مسجد کی طرف چلا آ رہا ہے، حضرت نے لڑکوں سے کہا چلو کتابیں بند کر دو جمنا نہا آویں۔ اور اس سے کہا اور ہم کے وہیں رکے رہو یہاں نہ آنا سب نہانے گئے وہ بھی نہایا۔ اس نے بعد میں کہا کہ مجھ کو نہانے کی حاجت تھی حضرت نے کس عنوان لطیف سے متنبہ فرما دیا۔

حضرت گنگوہی رح کا ایک طالب علم تھا جو حضرت کی خدمت کیا کرتا تھا، رات کو بستر بچھاتا پیر دباتا اور جب حضرت سو جاتے تو قریب ہی لیٹ جاتا تھا کہ حضرت کس وقت پکاریں اور ضرورت ہو، تاکہ فوراً اٹھ جائے اور جس کام کو کہیں کر دوں، وہ بازار بھی جایا کرتا اور سودا وغیرہ بھی لاتا، ایک دن ایک حسینہ پر اسکی نگاہ پڑی اور اس پر اس کا دل آ گیا، اور بات یہاں تک پہونچی کہ ایک شب وقت مقرر ہو گیا کہ فلاں جگہ انتظار کرنا میں آ جاؤں گا، اس رات کو بھی حسب معمول اس نے بستر بچھایا پیر دبائے اور جب سمجھا کہ حضرت سو گئے تو اپنے بستر پر جانے کے بجائے وہیں چلا کہ اچانک گرج چمک کے ساتھ ایسا بادل آیا کہ وہ گھبرا گیا کہ اگر حضرت اٹھ گئے تو ہماری خیر نہیں اور فوراً لوٹ آیا جب بستر کے قریب پہونچا تو نہ بادل نہ گرج نہ چمک کچھ نہیں سب غائب ہو گیا، صبح کو حضرت نے فرمایا افسوس! لوگوں کا کیا حال ہے کہ مجھے تکلیف پہونچاتے ہیں۔ یہ برکت تھی اور فیض تھا کہ پھر اس کا دل اس سے ہٹ گیا۔

فرمایا! جب آدمی بدنگاہی نہیں کرتا تو اس کے قلب میں ایسا نور پیدا ہوتا ہے کہ سبحان اللہ اگر بدنظری میں مبتلا ہے تو اس کے چہرے پر ظلمت و تاریکی لازم ہے اگرچہ وہ کتنا ہی حسین و جمیل ہو اہل نظر دیکھ لیتے ہیں، حضرت تھانوی رح جب کانپور میں پڑھایا کرتے تھے ایک دن ارادہ کیا کہ ہمارے حضرت مولانا فضل رحمن صاحب رح سے مل آئیں، تو دو رکعت نماز پڑھی اور استغفار پڑھنے کو کہا اور فرمایا کہ جب اللہ والوں کے پاس چلو تو استغفار پڑھ لیا کرو۔

فرمایا! طاعت کے اندر ایک نور ہے قرآن مجید میں آیا ہے افمن شرح اللہ صدرہ للاسلام فھو علی نور من ربہ۔

فرمایا! میں نے ایک شعر کی اصلاح کر دی ہے، غالب کا ایک شعر ہے ؎

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

میں نے کہا ؎

جانتے گر ثواب طاعت و زہد
پھر طبیعت ادھر نہ کیوں آتی

ایک مٹی کا پیالہ ہمارے پاس ہو اور کوئی ہم سے کہے کہ اس کو توڑ دو ہم تمہیں سونے کا پیالہ دیتے ہیں تو کون ایسا ہے جو یہ نہ لے لے، ہم ذرا ذرا سی حقیر چیزوں کے لئے تو لڑتے مرتے ہیں، اگر جانتے طاعت و زہد کا بدلہ کیا ملنے والا ہے تو قربان ہو جاتے، غالب کا ایک اور شعر ہے ؎

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

فرمایا میں نے اسی پر کہا ہے ؎

موت کو آپ نے نہیں سمجھا
نیند اس واسطے نہیں آتی
موت مومن کے حق میں تحفہ ہے
روح جنت میں کیا نہیں جاتی

موت تو ایک پل ہے جس سے ہو کر بندہ اپنے مالک کے حضور جاتا ہے۔

فرمایا! حمید صدیقی صاحب مجھ سے بہت محبت فرماتے تھے اور کچھ کہتے تو فرماتے پہلے آپ کو سناتا ہوں تب کہیں دیتا ہوں، وہ ایک دفعہ انتظام نہ ہونے کی وجہ سے حج و زیارت کو نہ جا سکے، محبت کے حالات و کیفیات ہوتے ہیں، نہ جانے کا غم ہونا یہ بھی محبت کی ایک چیز ہے اور یہ بھی ایک مقام ہے لیکن اس سے اونچا بھی مقام ہے کہ وہ سمجھے کہ یہ موانع کس نے بھیجے، وہ نہیں چاہتا کہ میں جاؤں، تو انہوں نے جو کچھ کہا بہت اچھا کہا تھا لیکن میں نے اپنے مزاج و مذاق کے مطابق کر دیا۔

حمید نے کہا ؎

ہم اب کی بار بھی کوئے نبی میں جا نہ سکے
جو چاہتے تھے وہ دل کی مراد پا نہ سکے

میں نے اس طرح کر دیا ؎

جو دل کو شمع محبت سے جگمگا نہ سکے
وہ ہائے پردہ کو جلوہ کبھی بنا نہ سکے
نظر کو اپنی جو ان کی نظر بنا نہ سکے
لطیف جلوے نگاہوں میں انکی آ نہ سکے

فرمایا! عشق و محبت ہے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے قانون و شریعت بھی نازل فرمائی ہے اگر صرف عشق و محبت ہوتی اور قانون شریعت نہ ہوتی تو یہ عشق و محبت بجائے راہ دکھانے کے کھڈ میں گرا دیتے ؎

بھٹک کے منزل جاناں سے دور جا پہونچے
جو جوشِ عشق میں جذبات کو دبا نہ سکے
نہیں ہیں جو ترے دیوانے آجتک وہ کبھی
خوشی میں رو نہ سکے غم میں مسکرا نہ سکے
وہی مقام محبت ہے حضرت احمد
جہاں کوئی بھی سوا انکے یاد آ نہ سکے

حضرت مولانا محمد یوسف بنوری کا سانحۂ ارتحال

از: ڈاکٹر تقی الدین ندوی
ریاسۃ القضاء الشرعی ابوظبی

اس عالم کی کسی چیز کو بقا و دوام نہیں "کل من علیھا فان" مگر بعض حادثات ایسے پیش آتے ہیں کہ اس کا اثر نہ صرف ایک خاندان و جماعت پر پڑتا ہے، بلکہ پوری ملت اس سے متاثر ہوتی ہے، اور ہر صاحب ایمان کے قلب پر چوٹ و زخم لگتا ہے، اور مدتوں اس کی یاد تازہ رہتی، ان میں حضرت مولانا بنوری کا سانحہ ارتحال ہے، ملت اسلامیہ میں یہ ایک ایسا خلاء ہے جس کے پُر ہونے کی بظاہر کوئی توقع نہیں، اور یہ سانحہ ایسے وقت اور ایسے زمانہ میں پیش آیا کہ ان کی ذات گرامی کی سب سے زیادہ ضرورت محسوس کی جا رہی تھی، وہ اپنی بعض خصوصیات میں ممتاز و منفرد تھے، وہ اس دور میں حضرت علامہ کشمیری کے علوم کے حامل اور ترجمان تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو قوت حافظہ نادرہ روزگار عطا فرمائی تھی، وہ اس عصر کے ایک طرف ممتاز ترین محدث اور فقیہ تھے تو دوسری طرف مفسر و متکلم تھے، عربی زبان پر غیر معمولی قدرت رکھتے تھے،

اس ناچیز نے اپنی طالبعلمی کے زمانہ میں ان کا اسم گرامی اپنے اساتذہ کے حلقہ میں سنا تھا، سب لوگ ان کے علم و فضل کے معترف تھے، اسلئے ان سے استفادہ اور ان کی زیارت کا ہمیشہ اشتیاق رہا، دار العلوم ندوۃ العلماء میں اپنی تدریس حدیث کے زمانے میں خاص طور سے جب ترمذی پڑھانے کا اللہ تعالیٰ نے موقع عطا فرمایا، تو اسی زمانے میں حضرت مولانا مرحوم کی کتاب "معارف السنن" کی تین جلدیں طبع ہو کر آ گئی تھیں، اس کے دو دو نسخے حضرت مولانا نے حضرت مولانا علی میاں صاحب مدظلہ، اور حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہ کے نام ہدیۃً ارسال کئے تھے، پہلی جلد حضرت مولانا علی میاں صاحب نے اور دو جلدیں حضرت مولانا نعمانی نے اس ناچیز کو ہدیۃً عنایت فرمائی، بعد میں بقیہ جلدیں بھی آ گئی تھیں، اور اس سے استفادہ کی مقدور بھر کوشش کی۔

جامع ترمذی" باب ماجاء فی الوضوء من الموطی" میں مجھے ایک اشکال پیش آیا، وہ یہ کہ اس باب کی حدیث جو عن محمد بن ابراھیم عن ام ولد لعبد الرحمن، کے طریق سے مروی ہے، امام ترمذی نے فرمایا کہ دوسرے طریق میں عن ام ولد لھود بن عبد الرحمن بن عوف ہے، جو وہم راوی ہے، صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث عن ام ولد لابراھیم بن عبد الرحمن بن عوف ہے مگر امام ترمذی نے عن ام ولد لعبد الرحمن پر کوئی کلام نہیں کیا، اس سے ان کے کلام سے ایک طرح کا اشتباہ پیدا ہوتا ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان کے ترجمہ میں تہذیب التہذیب وتقریب التہذیب میں جو کچھ لکھا ہے، ان دونوں کو ملانے کے بعد بھی یہ اشتباہ والتباس برقرار رہتا ہے، اس کو مفصل طور سے حضرت مولانا مدظلہ، کو لکھ کر بھیجا، جواب میں تحریر فرمایا کہ اگر حافظ نے فیصلہ نہیں کیا ہے، تو مشکل ضرور ہے، مگر متعذر نہیں، ام ولد لعبد الرحمن بھی وہم راوی ہے،

آج سے ۴ سال قبل یہ ناکارہ قاہرہ سے جہاں پر" بذل المجھود" کی طباعت کے لئے مقیم تھا، حج کے لئے حاضر ہوا، معلوم ہوا کہ حضرت مولانا بنوری رح بھی تشریف لائے ہوئے ہیں، اور ہر سال ان کی تشریف آوری ہوتی تھی، ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انکی مجلس میں اچھا خاصا مجمع تھا، جس میں اکثر ساؤتھ افریقہ کے لوگ تھے، ملاقات پر بہت ہی مسرت و بشاشت کا اظہار ہوا، اور بہت ہی اہم علمی گفتگو فرماتے رہے، فرمایا کہ میں نے "معارف السنن" پر مقدمہ الگ سے لکھا ہے، جو تقریباً ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، اس ناچیز نے عرض کیا کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قول "فیض الباری" میں نقل کیا گیا ہے کہ" التمھید لما فی الموطأ من المعانی والاسانید "کو فتح الباری پر ترجیح ہے، یہ کس اعتبار سے ہے، فرمایا کہ حافظ ابن عبد البر غیر متعصب اور انصاف پسند ہیں۔

اسی مجلس یا کسی دوسری مجلس میں "معارف السنن" کی طباعت کا تذکرہ فرمایا کہ کتاب کی ضخامت کو دیکھتے ہوئے مجلس علمی کا خیال ہوا کہ مختصر کر دی جائے اس لئے کہ اس میں معارف بہت آئیں گے، فرمایا کہ میں اس پر راضی نہ ہوا اور ملتزم شریف پر حاضری کے موقع پر اس کی طباعت کے لئے دعا کی، یا اللہ تو غیب سے اس کا انتظام فرما دے، اس کے چند ہی دن کے بعد ساؤتھ افریقہ سے ایک صاحب کا خط آیا کہ ہم طباعت کے لئے تیار ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ" معارف السنن" میں حضرت مولانا مرحوم نے جو تحقیقات کے نوادر بکھیرے ہیں، جس طرح سیکڑوں مراجع و مصادر کے مطالعہ کے بعد انسے کام کی بات نکال لی ہے، یا جس طرح ملخص فرما دیا ہے، یہ انھیں کا حصہ تھا، اور ان کی یہ کتاب انہیں ہمیشہ زندہ و جاوید رکھے گی، اور علمی دنیا اس سے فیضیاب ہوتی رہے گی، اسی طرح ان کی کتاب "یتیمۃ البیان فی مقدمۃ تفسیر القرآن" دیکھنے میں تو ایک مختصر رسالہ ہے، مگر تفسیر کے طالب علم کے لئے اس میں بہت بڑا خزانہ جمع فرما دیا ہے، "مشکلات القرآن" پر ان کا مقدمہ بھی بہت سی نادر خصوصیات کا حامل ہے، ان کے علاوہ بھی حضرت مولانا مرحوم کی متعدد تصانیف ہیں،

وہ فتنہ قادیانیت کو اس دور کا سب سے بڑا فتنہ سمجھتے تھے، اور اس کی تردید میں متعدد مقالات رسالہ "بینات" میں تحریر فرمائے، اور عربی میں ایک مستقل کتاب رد قادیانیت میں تحریر فرمائی، جب پاکستان میں رد قادیانیت کی تحریک چلی تو تمام جماعتوں نے متفقہ طور پر حضرت مولانا کو اس کا صدر منتخب کیا، اور ان کی قیادت میں یہ تحریک اتنے زور و شور سے چلی کہ بالآخر سابق حکومت کو اس کے سامنے جھکنا پڑا، اور قادیانیت کو اقلیت غیر مسلمہ قرار دینا پڑا۔

حضرت مولانا سلف صالحین کے مسلک پر پابندی سے قائم تھے، اس سے انحراف کو ملت کے لئے خطرہ تصور کرتے تھے، اور اس کے خلاف ہر چیز اور ہر تحریر کے مخالف تھے، امام مالک کا مشہور مقولہ ہے کہ اس کی امت کی اصلاح اسی راستہ پر چل کر ہوگی جس پر اس امت کی اولین جماعت کاربند تھی، حدیث پاک کی طویل خدمت اور اشتغال نے ان کے سینہ مبارک کو حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بھر دیا تھا، متوکلانہ زندگی کے باوجود ہر سال تقریباً رمضان المبارک میں مدینہ منورہ حاضر ہوتے تھے اور مسجد نبوی میں اعتکاف فرماتے تھے، تراویح کے بعد قرآن پاک کسی قاری و حافظ سے نوافل میں سنتے تھے۔

حضرت مولانا خالص علمی و تحقیقی آدمی تھے ان کی شہرت مشرق و مغرب ہر جگہ تھی، جس کا اعتراف مصر و شام کے علماء کو بھی تھا، میں نے اپنے زمانہ قیام قاہرہ وہاں کے تمام بڑے علماء شیخ ابو زہرہ، و شیخ الازہر دکتور عبد الحلیم محمود وغیرہم کو مولانا کے علم کے معترف و قدرداں، اور ان کی مؤلفات کا مدح خواں پایا۔

حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدفیوضہم سے خصوصی تعلق تھا، اور یہ تعلق آخری دور میں بہت بڑھ گیا تھا، حضرت بھی انکا بہت خیال فرماتے تھے، حضرت شیخ مدفیوضہم کی ان کی کتاب موطا کی شرح "اوجز المسالک" اور بخاری کی تعلیق "لامع الدراری" پر عربی میں حضرت مولانا نے مقدمے تحریر فرمائے ہیں، یہ دونوں مقدمے اپنی خصوصیات میں شاہکار ہیں، جس سے حضرت مولانا کی علم حدیث پر قدرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ حضرت مولانا کے کارناموں میں سے مدرسہ عربیہ نیوٹاؤن کراچی ہے جس کے بانی حضرت مولانا ہی تھے، یہ مدرسہ عرب و عجم میں ہر جگہ شہرت رکھتا ہے، ابھی جولائی میں ہندوستان سے واپسی پر تین دن کے لئے کراچی حضرت مولانا ہی کا مہمان رہا، اور انکے مدرسہ ہی میں قیام تھا، فجر کی نماز کے بعد تلاوت قرآن کا منظر بڑا نرالا تھا، حضرت مولانا سے اس کا ذکر کیا تو اس پر بہت ہی بشاشت کا اظہار فرمایا، اس مدرسہ میں حضرت مولانا نے متعدد اہل علم و اہل کمال کو جمع کر لیا تھا، دورہ حدیث میں طلبہ کی ایک بڑی جماعت زیر تعلیم ہے، اپنی سادگی اور طرز میں یہ مدرسہ سلف کی یادگار ہے، مدرسہ میں مجلس تحقیقات کا ایک اہم شعبہ ہے، جس میں تحقیقی و علمی کام ہو رہا ہے، جس کو ترقی دینے کی حضرت مولانا کو بہت فکر تھی، اللہ تعالیٰ اس مدرسہ کو دن دونی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔

اس مدرسہ کے لئے کبھی چندہ کی اپیل حضرت مولانا نے شائع نہیں کی، محض توکل علی اللہ کام پورا ہوتا رہا اور اہل خیر اعانت فرماتے رہے، اس ناچیز نے عرض کیا کہ حضرت آپ کے مدرسہ کی باہر ممالک تک شہرت ہے، اس لئے اسکے مقاصد و نظام وغیرہ کو عربی میں شائع ہونا چاہیے فرمایا کہ بھائی مجھے بیجا شہرت پسند نہیں، مگر لوگوں کا اصرار ہے تو مختصراً شائع کر دیا جائے گا، مولانا عبد الرزاق صاحب جنھوں نے قاہرہ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ہے، وہ اس کام کو کر دیں گے۔

موجودہ حکومت جو حضرت مولانا کی قدرداں تھی اور اہم کام لینا چاہتی تھی اور اسی سلسلے میں کراچی سے اسلام آباد تشریف لے گئے تھے کہ اچانک سانحہ ارتحال پیش آیا، ۱۷ اکتوبر کو پاکستان ریڈیو سے یہ جانکاہ خبر سنی گئی، دوسرے دن یہاں کے مشہور روزنامہ اخبار "الاتحاد" نے بھی یہ خبر شائع کی یہاں کے اہل علم و مشائخ سب نے بہت ہی رنج کا اظہار کیا۔ بالخصوص یہاں کے سب سے بڑے عالم شیخ احمد بن عبد المبارک رئیس القضاء الشرعی (چیف جسٹس) نے جو حضرت مولانا کے بڑے قدرداں تھے، ان کو ابوظبی کی دعوت بھی دے چکے تھے، بہت رنج و غم کا بار بار اظہار فرمایا کہ اب کا بدل کہاں ملے گا، اور ایصال ثواب کی تاکید کی۔

آسمان ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

مطالعہ کی میز پر

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

از شمس تبریز خاں

جدید عربی شاعری: از نسیمہ فاروقی ایم، اے، صفحات ۲۰۷ - قیمت ۸ روپے
پتہ: اسلامک بک سنٹر ۲/۲۱/۲۰۵، مکارم نگر لکھنؤ

اُردو میں فارسی شاعری کے مقابلے میں عربی شاعری پر بہت کم توجہ کی گئی ہے جو بہت افسوسناک صورت حال ہے۔ حالانکہ عربی شاعری کسی طرح فارسی سے کم مایہ نہیں، اردو میں عربی ادب پر بہت ہی کم سرسری اور سطحی کتابیں ملتی ہیں جن سے عربی کے صاحب ذوق لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور ان کو عربی مراجع ہی دیکھنا پڑتا ہے۔

نسیمہ صاحبہ نے جدید عربی شاعری کو اپنا موضوع بنایا ہے اور ۱۸۰۰ء سے ۱۹۵۰ء تک کے مشاہیر شعراء کے سوانح و افکار سے بحث کی ہے پس منظر کے طور پر جاہلی و اسلامی، عباسی و عثمانی شاعری پر بھی مختصراً لکھ دیا ہے پھر چند جدید شعراء کی حیات و شاعری پر لکھا ہے جس میں اختصار کے ساتھ بڑی حد تک جامعیت کا حق بھی ادا کیا ہے اور اس طرح بیک نظر مدارس عربیہ کالجوں کے طلبہ، اور عام اردو داں طبقہ ممتاز اور جدید عرب شعراء سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں نمونۂ کلام اور ماخذ و مراجع کی فہرست سے کتاب کی افادیت اور بڑھ گئی ہے۔ زبان بھی رواں، سلیس اور عام فہم ہے البتہ کہیں کہیں کوئی لفظی خامی نظر آئی جو چنداں قابل لحاظ نہیں جیسے "پیشکش" کے بجائے کسی مقام پر "پیشکشی" کی ترکیب نظر آئی۔

امید ہے کہ مصنفہ (جیسا کہ انہوں نے خود بھی لکھا ہے) اگلے اڈیشن میں دوسرے جدید اور اہم شعراء کو بھی شامل کریں گی جو اس مختصر کتاب میں نہیں آسکے ہیں۔ موجودہ صورت میں بھی کتاب عربی ادب سے ذوق رکھنے والوں کے لئے ایک خوشگوار تحفہ ہے۔

نفیر آتشیں (مجموعۂ کلام): از جناب بیباک بھوجپوری، صفحات ۲۲۴ - قیمت ۱۰ روپے
پتہ: بیباک صاحب، نیا بھوجپور، ضلع بھوجپور (بہار) نیز مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

بیباک صاحب بھوجپوری بہار کے مشہور اور کہنہ مشق شاعر ہیں، غزلوں سے انھیں زیادہ دلچسپی نہیں اس لئے زیادہ تر نظمیں کہتے ہیں، ڈاکٹر اقبالؒ کے شیدائیوں میں ہیں اس لئے ان کے کلام اور طرز کلام میں جا بجا اقبال کا رنگ جھلک اٹھتا ہے، ان کے موضوعات ملک و ملت کے بگڑے ہوئے نقوش و آثار ہیں اور بقول شاعر "سیاسی ہوسناکی، فسطائی ذہنیت، اور استحصال پسندی کو بے اندازہ دور کرنا، اور تملق پسندی کا سہارا لے کر سیاسی مفاد حاصل کرنے والوں کے مجذوم عارض و اجسام سے نقاب الٹنے کی تحریک چلانا" شاعر کے اساسی افکار میں ہے، شاعر ایک مسلمان اور درد مند دل، اور تیز نگاہ رکھتا ہے، اس لئے عصر حاضر کے اخلاقی بگاڑ، طبیعتوں کے فساد، قدروں کی شکست و ریخت اور مغربیت کی اندھی تقلید کے خلاف اس کا قلم نیز نشتر اور تیغ و تیر بن گیا ہے اور اس نے بگڑے ہوئے معاشرے پر تیکھے اور چبھتے ہوئے طنز کے بھرپور وار کئے ہیں، کہیں کہیں اس رنگ میں شدت کے سبب یہ "تلخ نوائی" گراں بھی گزرتی ہے مگر اقبالؒ کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے اس سے "کار تریاقی" کی امید رکھی جا سکتی ہے۔ کتاب کے شروع میں پروفیسر طلحہ رضوی برق، پروفیسر عبد المغنی، اور ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد صاحبان نے شاعر کے کلام کی داد دی ہے اور مقدمے لکھے ہیں۔

ہم یہاں مختصر طور پر بطور نمونہ چند اشعار درج کرتے ہیں اور قارئین خصوصاً اسلام پسند ادبی حلقوں سے اس کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں کہیں کہیں زبان اور بیان کھٹکتا ہے مگر شاعر کے خلوص و سنجیدگی کے پیش نظر انہیں نظر انداز کر دینا پڑتا ہے۔

نظموں اور غزلوں کے متفرق اشعار:

حرم کی عزت و تقدیس کا اللہ حافظ ہے
درِ آذر پہ ابراہیم سجدہ ریز ہے ساقی

فراز دار پہ روشن کرو خودی کے چراغ
لہو بھی چاہئے تعمیر راستی کے لئے

اک ترقی یافتہ اسلام تازہ ڈھالیے
کافر و زندیق و مشرک جسکی مانیں سب ہی بات

جو سیاست کے صنم خانوں میں ہوتے ہیں ادا
کیا حضورِ حق بھی کام آئیں گے وہ صوم وصلات

بہار آئی گھٹا اٹھی، گری بجلی نشیمن پر
خبر کیا تھی کہ فصل گل میں ہم بے خانماں ہونگے

کفر و اسلام کے مابین تفاوت نہ رہا
شیخ کے کشف و کرامات سے جی ڈرتا ہے

امتیازِ حق و باطل ہی نہ مٹ جائے کہیں
عصر حاضر کی مساوات سے جی ڈرتا ہے

صنم کدے بھی ہیں کعبے کی راہ میں حائل
تلاش حق میں ذرا آگہی کے ساتھ چلو

عضو باطل بن گئے ہیں قوم کے دانائے راز
آستانِ بوالہوس کا ہر گدا فنکار ہے

تحریص کی بھٹی میں خطرہ ہے کہ ناصح کی
دستار نہ جل اٹھے، تسبیح نہ گل جائے

قاعدہ تعلیم القرآن (بامعنی تین حصّوں میں):
پتہ: ادارہ فروغ عربی، مئو ناتھ بھنجن - اعظمگڈھ (یو۔پی)

اس جدید قاعدے کے مرتب حافظ فضل الرحمٰن صاحب بزمی ہیں جنھوں نے قواعد بغدادی کے طریقے سے ہٹ کر (جس میں بے معنی الفاظ رٹائے جاتے ہیں) ایسا قاعدہ ترتیب دیا ہے جس کے ذریعہ بچوں میں ناظرہ قرآن خوانی کے ساتھ عربی کے الفاظ کے معانی بھی سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ انہوں نے انگلش پرائمرس کا طریقہ اپنایا ہے جو ایک مفید کوشش ہے، ہم مدارس و مکاتب عربیہ کے ذمہ داروں سے درخواست کرتے ہیں کہ اس قاعدے کی افادیت پر غور کر کے اسے داخلِ نصاب کریں۔

اتنا فائدہ ضرور ہوگا

افتخار فریدی، مراد آباد

اس وقت ہمارا ملک جن حالات سے دوچار ہے اس کو دیکھتے ہوئے اس کا ہر وقت خطرہ لگا ہوا ہے کہ کوئی ایسا انقلاب کسی وقت بھی اچانک آسکتا ہے جو اس ملک کے رہنے بسنے والے انسانوں کی مذہبی داخلاقی اور مالی نظام زندگی کو درہم برہم کر ڈالے۔

ملت ہندیہ کی دینی خدمات انجام دینے والے مدارس۔ خانقاہیں، جماعتیں اپنے اپنے پُرخلوص و مقبول عمل جن کی اہمیت و افادیت اپنی جگہ مُسلّم ہے کے باوجود اس طوفان کو روک لگانے میں بے بس ہیں اور پوری طرح یہ سب بھی اس کی زد پر ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و محنت و قربانی کے نقشے پر فی الحال اگر ہم نہیں پہنچ پا رہے ہیں جس پر قیامت تک کے لئے پورے عالم کی سرسبزی کا انحصار ہے تو کم از کم اپنے دینی کاموں کی حفاظت و بقا کی تدبیر کے طور پر (کے درجہ میں بھی اگر یہ سلامت رہے تو خدا ایک دن وہاں تک پہونچا ہی دے گا)۔ امت دعوت (غیر مسلموں) میں دعوت کا عملی اقدام بطور وظیفہ کے صرف محدود پیمانہ پر ہر مسلم اپنی دنیوی اغراض کے سبب جن غیر مسلموں سے اختلاط رکھنے پر مجبور ہے اُن کے لئے یہ نیت کر کے کہ خدا مجھے اسکو ہدایت پانے کا ذریعہ بنادے دعائیں مانگتا ہے اور اگر کوئی تدبیر اسلام کا پیغام پہونچانے کی کسی وقت خدا اس کو سُجھادے تو پیش بھی کر دے۔ یہ تمام نبیوں والی دعوت کی نقل کتنی ہی بے جان طریقہ پر ہو اس کا اتنا فائدہ ضرور حاصل ہوگا۔ ہدایت کو قبول نہ کرنیوالے محروم انسان اور دعوت دینے والے مسلمان مع اپنے دینی کاموں کے اُس طوفان سے محفوظ رہیں۔

بغیر دعوت کی نیت کے غیر مسلموں سے اختلاط قلوب پر سخت ترین اثر ڈال رہا ہے جس کے نتیجہ میں پورا عالم اسلام اپنوں کی گردنیں کاٹنے میں مبتلا ہو چکا ہے۔ . . . (ایک دعا) اگر ہو سکے تو سوتے وقت دو رکعت نماز صلوٰۃ استخارہ اور صبح قبل فجر یا بعد اشراق دو رکعت صلوٰۃ حاجت کے نام سے نفل پڑھ کر یہ دعا مانگ لیا کریں کہ خدا مجھ سے وہ کام لے لے جو اس زمانے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اقدس کو ٹھنڈک پہونچانے کا باعث بن جائے۔

مطالعہ کی میز پر

(تبصرہ کے لئے کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں)

حبیب اللہ ندوی

افکار و اقدار: مصنف طیب عثمانی - تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ صفحات: ۲۳۲
کتابت طباعت اچھی - قیمت: ۱۲ روپے
ناشر: دار الکتاب، نیا کریم گنج، گیا (بہار)

اگرچہ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کا جھگڑا ابھی موجود ہے مگر دورِ حاضر میں جب کہ زندگی کا مفہوم بہت وسیع اور گوناگوں ہو گیا ہے اور زندگی ہمہ جہت ہو گئی ہے تنہا ادب کا کوئی تصوّر نہیں رہ گیا ہے۔ ادب کا کسی نہ کسی زاویہ سے زندگی سے ربط و تعلق ضروری ہے ادب کو زندگی کا ترجمان بنانے والوں میں ایک گروہ مارکسی اہل قلم کا ہے جو اپنے کو ترقی پسند کہتا ہے وہ ادب میں سراسر مادی تصور اور مادی خیالات کا قائل ہے۔ ان کے نزدیک کسی مادی بنیاد کے بغیر شعر و ادب کی دنیا خواب و خیال کی دنیا ہے۔ ان کا اعتقاد ہے کہ خالص حیوانی عناصر ہی انسانی تہذیب و تمدن اور فن کی بنیاد ہیں۔ ان کے بالمقابل ایک دوسرا گروپ ہے جو کہتا ہے کہ یہ توصحیح ہے کہ انسان کا مادہ سے اٹوٹ تعلق ہے، مگر قدرت نے انسان کو بھوک، پیٹ اور جنس کے علاوہ بھی کچھ صلاحیتیں دی ہیں جو اپنا تسکین چاہتی ہیں۔ ادب اگر زندگی کا ترجمان ہے تو ضروری ہے کہ اسمیں زندگی کی اعلیٰ قدریں اور اخلاقیات کو فن کی بنیاد قرار دیا جائے جتنی اعلیٰ قدریں ہونگی، اتنا ہی اعلیٰ آرٹ اور فن کا نمود ہوگا۔

جناب مولانا طیب عثمانی ندوی کی زیر نظر کتاب "افکار واقدار" جو مصنف کے ۱۹۵۶ء سے ۱۹۷۵ء تک کے ادبی تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے، دوسرے تصور کی ترجمانی کرتی ہے۔ خیالات و رجحات کا اندازہ اس کے ان عناوین سے لگایا جا سکتا ہے۔ ادب میں معیار و اقدار کا مسئلہ، ادب میں اخلاقی اقدار کا تصور، فن مقصد اور کردار ادب اور تحریک۔ ہماری ادبی فروگذاشتیں۔ اقبال کا پیام۔ جگر مراد آبادی۔ رشید احمد صدیقی کا فکر و فن۔ اختر اورینوی کا نظریۂ فن، نذیر احمد کی ناول نگاری، سید قطب شہیدؒ، فکر ابو الکلام، اقبال کی شاعری میں آدمیت کا مقام

ان مضامین میں مصنف نے تفصیل و وضاحت سے یہ ثابت کیا ہے کہ ادب برائے ادب کوئی چیز نہیں۔ اور ادب برائے زندگی میں بھی تعمیری ادب قابل قبول ہے اور نہ صرف قابل قدر بلکہ ادب و فن کے لئے ضروری بھی۔ کیونکہ ادب احساسات و خیالات کا غلط کالبد ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جتنے اچھے اور حسین خیالات ہوں گے اتنا ہی حسین کالبد تیار ہوگا، جتنی اونچی قدریں ہونگی اتنا ہی اونچا آرٹ قرار پائے گا۔ تو اعلیٰ ادب وہی ادب ہوگا جسمیں دل دردمند فکر ارجمند اور زبان ہوشمند جمع ہوں۔

عملی تنقید میں جن ادیبوں کے فکر و فن پر کلام کیا ہے اس سے یہی ثابت ہوتا ہے، یہ مصنفین اپنے فکر و فن اور زبان و ادب میں اعلیٰ قدروں اور بلند اخلاق و کردار کے حامل و داعی تھے، اور زبان و فن کے ساتھ فکر و دعوت بھی رکھتے تھے۔

طیب عثمانی ندوی سرزمین بہار کے مایہ ناز مصنف اور گنے چنے تنقید نگاروں میں ہیں تعمیری و تحریکی ادب میں یہ کتب نہ صرف ان کے فکر و نظر اور علم و فن کی گہرائی و گیرائی پر دال ہے بلکہ یہ تنقیدی ادب میں ایک بہترین اضافہ اور قیمتی تحفہ ہے۔

کتاب کی قیمت سائز و حجم کے اعتبار سے زیادہ ہے۔

تبرکات: ترجمہ و ترتیب: نور الحسن راشد - تقطیع: $\frac{18 \times 22}{8}$ صفحات: ۹۲
کتابت طباعت عمدہ، مجلد خوبصورت گرد پوش کے ساتھ - قیمت: درج نہیں
ناشر: مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، کاندھلہ ضلع مظفر نگر (یو۔پی)

"تبرکات" مکاتیب کا مجموعہ ہے اور مرتب کی تحریر کے مطابق "سلسلۂ مکاتیب اکابر" کی پہلی کڑی ہے اس میں کل نو مکتوبات ہیں، پہلا مکتوب حاجی امداد اللہؒ کا اور بقیہ آٹھ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ہیں۔ یہ مکتوبات فارسی میں ہیں۔ ساتھ ساتھ اردو ترجمہ اچھا ہے۔ ابتداء میں آٹھ صفحات پر مشتمل "چند باتیں" کے عنوان سے مترجم نے تعارف کرایا ہے پھر خطوط اور ان کے تراجم کا سلسلہ ہے جو ۱۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ زیادہ تر سفر حج کے حالات ہیں اور کہیں کہیں مریدین و متوسلین کے لئے ہدایات و ارشادات ہیں۔ حقوق العباد کی ادائیگی کی تلقین اور تاکید ہے۔ خطوط کے بعد حواشی ہیں جس میں مرسل الیہم اور مکتوبات میں مذکور اشخاص و مقامات کا تعارف ہے۔ خصوصاً مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا مظفر حسین کاندھلوی اور بابا فرید گنج شکر پر مفصل نوٹ ہے جو مستقل مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ آخر میں پندرہ صفحات پر مشتمل ایک اشاریہ ہے۔

مکتوبات میں انسان پوری آزادی کے ساتھ اپنے خیالات و نظریات اور فکر و دعوت کا اظہار کرتا ہے کسی دور کے معاشرتی و سیاسی ماحول اور صحیح علمی و ذہنی حالات کی آگہی کے لئے مکتوبات بہترین ذریعہ اور مراجع ثابت ہوتے ہیں۔ اسی اہمیت کے تحت عرصہ سے مکتوبات کی ترتیب و تدوین کا سلسلہ جاری ہے اور بہت سے مفید اور ضخیم مجموعہ مکاتیب اسلامی کتب خانوں کی زینت بن چکے ہیں۔ ابتداء صرف انھیں مکتوبات کی اشاعت ہوتی تھی جو علمی و فکری اور کلامی ہوتے تھے جس سے عام فائدہ ہوتا تھا بتدریج اس میں وسعت ہوتی گئی اور اب ہر قسم کے مکتوب حتی کہ ذاتی و خانگی قسم کے خطوط بھی شائع کئے جانے لگے ہیں۔ ہمارے وہ اسلاف جنھوں نے دعوت و تبلیغ میں اپنی زندگیاں ختم کر دیں۔ ان کی ہر ہر چیز اس قابل ہے کہ ان سے استفادہ کیا جائے۔ مکتوبات کی اشاعت میں بھی یہی جذبہ زیادہ ہوتا ہے کہ ان کی چیزیں محفوظ کر لی جائیں جو بطور "تبرک" یادگار رہیں۔ جیسا کہ زیر نظر مجموعہ کے نام سے بھی ظاہر ہے۔

بادۂ وحدت: (مجموعۂ نعت) از جمیل احمد نذیری - صفحات ۳۲
کتابت طباعت اوسط قیمت: ۵ / ۷ پیسے
ناشر: مکتبہ ایوب کاکوری لکھنؤ

زیر نظر کتابچہ جناب جمیل احمد نذیری مدرس دار العلوم فاروقیہ کاکوری کے سلاموں اور نعتوں کا مجموعہ ہے۔ ہر مسلمان کو حضورؐ کی ذات والا صفات سے انتہائی الفت و محبت اور عقیدت ہوتی ہے اور خواہش ہوتی ہے کہ کسی شکل میں اپنے احساسات کا نذرانہ ان کے حضور میں پیش کرے، اس مجموعہ میں بھی شاعر موصوف نے اپنے عقیدت کے جذبات اور محبت کے واردات کو الفاظ کا روپ دیا ہے اور انہیں نعتوں کی شکل میں ظاہر کیا ہے۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ہمارے نعت گو شعراء افراط و تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں اور حالیؔ کے الفاظ میں ؎

ولیوں کا نبی سے بڑھائیں
نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں

مگر زیر نظر مجموعہ اس مبالغہ اور غلو سے بہت حد تک پاک ہے۔

پیش لفظ میں شاعر نے مجموعہ کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ ان کی پہلی کوشش ہے۔ شعری معیار کا تجزیہ تو وہی کر سکتا ہے جس کو شعر و سخن سے لگاؤ ہو۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ پہلی کوشش خوش آئند ہے۔

ابتداء میں "خدا کے حضور میں" ایک مناجات ہے، پھر نعتوں کا سلسلہ ہے کہیں کہیں پیغامی نظمیں بھی ہیں۔ مجموعہ میں حدیث دل بھی ہے، حدیث دیگراں بھی ہے، اظہار شوق بھی ہے اور پیمان وفا بھی۔ پیغام عمل بھی ہے دعوت حق بھی، شکوہ و شکایت بھی ہے اور التجا و مناجات بھی۔

کتاب کا نام "بادۂ وحدت"، مجموعہ نعت کے لئے موزوں نہیں۔

ضرورت منشی

مطبع دار العلوم ندوۃ العلماء کے لئے ایک منشی کی ضرورت ہے جس کی ذمہ داریاں حسب ذیل ہیں۔
(۱) ملازمین مطبع کے کاموں کی نگرانی (۲) اجناس کی خریداری (۳) طلبہ کو اپنی نگرانی میں کھانا بھجوانا (۴) یومیہ مصارف نقد و اجناس کا باقاعدہ حساب رکھنا۔
تنخواہ بہ گفتگو کے بعد طے ہوگی۔

(مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مکتوب امریکہ

امریکہ کے معاشرہ کے چند پہلو

از: ماسٹر محمد سمیع صدیقی ایم۔ اے

اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

یہاں رنگ و بو کی گلستاں میں ہر کہہ و مہ زندگی بسر کرتا ہے۔ اسی میں انہماک ہے۔ عیش کی داد دینا مقصد حیات ہے۔ اگر یہاں کی خاندانی زندگی کو غائر نظر سے مطالعہ کیا جائے تو جو تقدس و احترام خاندانی اجتماعی زندگی کو مشرق میں حاصل ہے اس کی بے حد پامالی ہو رہی ہے والدین کا رشتہ اپنے بچوں اور بچیوں سے بچپن اور لڑکپن کی حد تک کافی خوش آئند نظر آتا ہے۔ والدین بچوں کی پرورش، تربیت تعلیم کی فکر رکھتے ہیں۔ انھیں پروان چڑھاتے ہیں، مگر معاشرہ میں جو عریانی ہے اور بے حیائی ہے اور برسر عام محبت کے اظہار کے جو طریقے ہیں بچے کم عمری سے خوگر ہوتے جاتے ہیں۔ جب بلوغت کو پہونچتے ہیں تو راہ فرار اختیار کرتے ہیں، والدین سے جدا ہو جاتے ہیں۔ جب کہ آغاز شباب کے وقت سخت رہبری کی ضرورت ہوتی ہے والدین دست بردار نظر آتے ہیں بچے اور بچیاں بھی گرل فرینڈ (Girl friend) اور بوائے فرینڈ (Boy friend) کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

والدین چشم پوشی نہیں بلکہ ہمت افزائی کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں یہ نوعیت طالبعلمی کے دور سے شروع ہو جاتی ہے۔ جب کوئی نوجوان طالبعلمی کے دور سے نکل کر زندگی کے مرکز میں قدم رکھتا ہے تو وہ والدین سے بے نیاز ہو جاتا ہے، علیحدگی اختیار کرتا ہے۔ والدین کس حال میں بسر کرتے ہیں کوئی فکر نہیں ہوتی۔ اگر عسرت میں گذر ہوتی ہے تو بیٹا دور ہی رہتا ہے۔

حال ہی میں ایک صاحب تذکرہ کر رہے تھے کہ ایک امریکی نوجوان عیش و مسرت کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ اس کا بوڑھا باپ شفقت پدری کا مارا ہوا ہوائی اڈے سے اُسے دیکھنے آیا۔ "ہیلو" کہے گئے۔ مگر عزت و احترام کا شائبہ نہ تھا۔ باپ پھر رخصت ہوا۔ مصافحہ ہوا مگر اتنی توفیق نہ ہوئی کہ بوڑھے باپ کو ایرپورٹ تک پہونچانے جاتا۔ کار بھی تھی۔ وقت بھی تھا باپ پھر تھکے ہارے چلے اور کس طرح ایرپورٹ پر پہونچے تصور بھی لرزہ براندام ہو جاتا ہے۔

والدین اور نوجوان کے تعلقات میں یہ سرد مہری۔ یہ شقاوت اور یہ کج ادائی اس سرزمین کا خاص حصہ ہے۔ طرفہ تماشہ اور بھی ملاحظہ ہو۔ جب کسی نوجوانوں کو کوئی تصدیق نامہ کہیں پیش کرنا ہے تو اُس پر ماں ہی دستخط کرتی ہے۔ اگر باپ دستخط کر دے تو حکومت یا ادارہ اُسے قبول نہیں کرتا۔ باپ کی کوئی حیثیت مانی نہیں جاتی ہے

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

خاندان کے ہر فرد میں حاب (Job) حاصل کرنا اور پیسے کمانا مقصد زندگی ہے۔ رشتہ ناطہ، خدمت، محبت، فکر و عمل سب اسی مقصد کے گرد حلقہ بنائے ہوئے ہیں۔ نوجوانوں کے طرز عمل پر یہ شعر صادق آتا ہے

جوانی کی دعا لڑکوں کو ناحق لوگ دیتے ہیں
یہی لڑکے مٹاتے ہیں جوانی کو جواں ہو کر

ملک ترقی یافتہ ہے۔ دولت کی ریل پیل ہے معاشرہ کے اخلاقی نظام میں اور نظریہ میں غیرمعمولی تبدیلی ہے اور ہوتی جا رہی ہے یعنی، نے پائے نظر کو آزادی خودبینی کو زنجیر نہ کر پر عمل ہو رہا ہے۔

انجیل مقدس میں حیات انسانی کیلئے مکمل نظام نہیں پایا جاتا۔ پاپائیت یعنی رومن کیتھولک مذہب نے اس سے فائدہ اٹھا کر حضرت مریمؑ کے کنوارے ہونے سے وہ شادی کرنا کتخدا لڑکیاں بے راہ روی اختیار کریں تو کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا۔

نیویارک ٹائمس کے اگست کے میگزین میں ایک مضمون شائع ہوا، "عنفوان شباب کی خیالی دنیا اور زچگی"۔

ایک صاحبہ نے سین فرانسسکو سے ایک سوال کا جواب کہ غیرشادی شدہ نوجوان مائیں اپنے بچوں کی پرورش و پرداخت کی فکر و خواہش کیوں رکھتی ہیں؟ وہ لکھتی ہیں ایسی ماؤں کی تعداد زیادہ ہو گئی ہے۔ کسی چودہ سالہ لڑکی کا انٹرویو کا تذکرہ یوں لکھتی ہیں:-

"ایک شب میرے والدین کسی کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے لڑکی بے زبان ہے، اپنی زندگی تباہ کر رہی ہے، اس لڑکی کی عمر ۱۶ سال تھی مجھ سے بڑی تھی۔ والدین میرے متعلق خیال کر رہے تھے کہ ہماری لڑکی ایسا نہیں کرے گی۔ میں خیال کر رہی تھی کہ والدین مجھے گھر سے نکال دیں گے۔ انہیں یہ توقع نہ تھی کہ میں بھی ویسا ہی ہو جاؤں گی۔ وہ مجھے بیوقوف مزید خیال کریں گے ان سارے تخیلات کے درمیان میرا ارادہ بچے کی نگہداشت کی طرف لگی رہتی۔

میں سوچتی تھی کہ یہ میرا ہی فعل ہے، بچہ کسی اور کا نہیں ہے۔ اگر والدین میری طرف التفات نہ کریں گے تو میرا بچہ ضرور کرے گا۔ وہ مجھ سے محبت کرے گا۔ مجھ سے سوالات کرے گا اور اس خیال پر مجی تھی کہ میں اس کی نگہداشت خود کر سکتی ہوں خواہ والدین نکال ہی کیوں نہ دیں"۔

یہ کہانی ایک ۱۴ سالہ لڑکی کی ہے سارا اسپرنگر (Sara Springer) جس کے گود میں تین ماہ کا بچہ تھا۔ اسکے بال سیاہ تھے بچہ باپ کے بجائے ماں سے زیادہ مشابہت رکھتا تھا اس لڑکی کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو جونیر ہائی اسکول پاس تھا۔ گذشتہ سال لڑکی اپنے والدین کے ساتھ ایک مقام پر تعطیل منا رہی تھی اس کے بعد اس شخص سے اس کی ملاقات نہ ہوئی سارا (Sara) اور اسکا بچہ جونتھن (Jonathan) والدین کے پاس رہتے ہیں۔ اسپرنگر کی بیوی بچہ کی دیکھ بھال کرتی ہے سارا نویں درجہ میں پڑھ رہی ہے۔ وہ آئندہ سال تعلیم ختم کرنا چاہتی ہے اور ملازمت کر کے اپنے قدموں پر کھڑا ہونا چاہتی ہے تاکہ اپنی اور بچہ کی کفالت کر سکے۔ بچہ پیدا ہونے سے پہلے والدین نے کئی بار دریافت کیا آیا وہ اسقاط حمل کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس کا جواب ہمیشہ نفی میں ہوتا۔ وہ کہتی کہ میں بچہ کو اس بے مہری سے ضائع نہیں کرنا چاہتی ہوں، نہ کسی کو دینا چاہتی ہوں کیونکہ بچہ ساری زندگی یہ خیال کرتا رہے گا کہ اس کی ماں نے اس سے بے التفاتی کی۔ میں تو اپنے بچہ کو خود رکھنا چاہتی ہوں"۔

The Planned Parent-hood Federation of Amrica کا کہنا ہے کہ عنفوان شباب میں بن بیاہی لڑکیاں دس لاکھ سے زیادہ ماں بن جاتی ہیں۔ چھ لاکھ اس قسم کے بچے سالانہ پیدا ہوتے ہیں ۹۰ فیصد بچوں کو رکھنا چاہتی ہیں یہ ملک میں پیدائش کی شرح کے اعتبار سے ۲۱ فیصدی ہے ماؤں کی عمریں ۱۲ سے ۱۹ سال تک ہوتی ہیں۔ ۹۴ فیصد مائیں بچوں کو جدا نہیں کرتی ہیں۔

گورنمنٹ کے اعداد و شمار کے مطابق پیدائش کی شرح دوسرے عمروں کے گروپ میں کم ہو رہی ہے۔ ۱۴ سے ۱۷ سال کی عمر کے گروپ میں پیدائش یکساں ہے۔ جبکہ ۱۴ سالہ نیز کم عمری میں پیدائش کی شرح حقیقتاً زیادہ ہو گئی ہے۔ رپورٹ نے اسے "وبا" سے تعبیر کیا ہے۔

سین فرانسسکو (San Francisco) کے معالجہ کے مرکز کا جائزہ لے کر جہاں متعدد لڑکیاں حاملہ ہو کر علاج کے لئے جمع ہیں۔ لکھتی ہیں:-

حقیقتاً آغاز شباب کے دور کا مطالعہ کیا جائے اور مجامعت کی جانچ کی جائے تو معلوم ہو گا کہ نوجوان عورتوں میں اس کا رجحان زیادہ ہو گیا ہے۔ وہ برتھ کنٹرول سے بھی انسیت نہیں رکھتیں۔ وہ حمل قرار پانے کو بدنامی تصور نہیں کرتیں جیسا کہ قبل کے نسلوں میں خیال کیا جاتا تھا اور معاشرت میں اُسے بُری نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ سوسائٹی کا یہ اصول کہ نیک لڑکیوں کو کنواری رہنا چاہئے اب بے معنی ہو گیا ہے۔ بن بیاہی ماؤں کو بُری نظر سے دیکھا جاتا تھا اب نظر انداز ہوتا جا رہا ہے۔ یہ نیا رجحان آغاز شباب کے دور میں لڑکیوں میں زیادہ پیدا ہو گیا ہے۔ نفسیاتی اور میڈیکل ماہرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کم عمر لڑکیاں ماں بننے کی صلاحیت کم رکھتی ہیں۔ ایسی شکل میں لڑکیوں کی اقتصادی حالت اور جذباتی پہلو تاریک نظر آتا ہے۔ اس بات کو وہ ان لڑکیوں کے حق میں بھی صحیح سمجھتے ہیں جو کم عمری میں غیر مناسب شادیاں کر لیتی ہیں۔ ایسی شادیاں عموماً علیحدگی کا شکار ہوتی ہیں۔ علم الاعداد کی تحقیق سے یہی پتہ چلتا ہے۔ ایسی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں کہ لڑکی دوسری شادی کرنے سے بھاگتی ہے۔ اپنے خیال میں وہ دوبارہ پھنسنا نہیں چاہتی جب یہ شکل پیدا ہو جاتی ہے تو لڑکی تنہا زندگی بسر کرنے کی خواہشمند ہوتی ہے۔ باپ بھی بچے کی پرورش میں کوئی مدد نہیں کرتا۔ عموماً وہ تعلق جو حمل رہنے سے پہلے قائم تھا وہ بھی اس کے بعد باقی نہیں رہتا اور ٹوٹ جاتا ہے ایسی لڑکیوں کی حالت (شادی شدہ اور غیرشادی شدہ دونوں کی) ماں بننے کے بعد پریشان کن بن جاتی ہے۔ یا تو خاندان کی کفالت پر بسر کرتی ہیں یا کسی ویل فیر (Well Fare) مرکز میں گذر کرتی ہیں۔ تعلیم کو خیرباد کہنا پڑتا ہے اور ملازمت کی فکر ہوتی ہے تاکہ کفالت کے مختلف جھگڑوں سے نجات مل جائے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ اس کے لئے مستقبل بنجر نظر آتا ہے معالجہ کے مرکز میں ایک اور لڑکی کا انٹرویو:-

کم عمر لڑکی (Gardy) کہتی ہے کہ میں اپنے باپ سے واقف نہیں ہوں۔ وہ الاسکا (Alaska) میں ہے، کوئی خبر بھی نہیں ملی ہے۔ یہ لڑکی حاملہ تھی۔ جب اس سے کہا جاتا تھا کہ تمہیں اسقاط اور قائم رہنے کے درمیان فیصلہ کرنا ہے کیونکہ تمہاری حالت کا یہی تقاضہ ہے اپنے بسر کرنے کی اور بچے کی نگہداشت کے متعلق کیا سوچا ہے؟ یہ ایسا دوسرے جگہ

(بقیہ صفحہ ۲۲ پر)

جشنِ عمرآباد کے دلکش مناظر

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی۔ پروفیسر و صدر شعبۂ عربی، کالی کٹ یونیورسٹی (کیرالہ)

جامعۂ دارالسلام عمرآباد کو علامہ سید سلیمان ندویؒ نے جنوبی ہند کا ندوہ قرار دیا تھا اس ادارے کی روشن خیالی، علمی عظمت اور عزائم کی بلندی اس کو عام عربی مدارس میں امتیاز عطا کرتی ہے۔ اس کی تاریخ حسنِ فکر و عمل کی دلکش داستان ہے۔ کاکا محمد عمر مرحوم (یعنی موجودہ کاکا محمد عمر زید مجدہ، سکریٹری جامعہ دارالسلام کے دادا، جنوبی ہند میں نام اس طرح بھی رکھے جاتے ہیں) ایک بڑے تاجر تھے انہوں نے ایک تجارتی سلسلہ شہر مدراس میں "روشن کمپنی" کے نام سے قائم کیا تھا اللہ نے ان کی پاکیزہ کمائی میں بڑی برکت دی، مگر اس دولت نے نہ ان کو اسراف پر قائل کیا اور نہ دنیاوی جاہ و حشمت کے حصول پر۔ انہوں نے سوچا کہ دولت آنی جانی ہے دنیا فانی ہے کیوں نہ اس سے ایسا کام لیا جائے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک سرخروئی اور امت اسلامیہ کے لئے باعث برکت ثابت ہو۔ اس خیال کے ماتحت انہوں نے ایک حسین و جمیل وادی خرید لی۔ دو چھوٹے چھوٹے دلکش پہاڑوں کے درمیان کی پوری زمین خرید کر اس میں ایک بستی بسائی اور اپنے نام کی مناسبت سے اس کا نام عمرآباد رکھا۔ ظاہر ہے کہ بستی بسانا کھیل نہیں ہے۔

یہ ایک بڑا کارنامہ ہے جو انہوں نے انجام دیا۔ اس بستی کو انہوں نے علم کے دیے سے روشن کیا۔ حق یہ ہے کہ انہوں نے روشنی کا ایسا مینار قائم کر دیا ہے جو انشاء اللہ تا ابد دلوں کو نور و سرور عطا کرتا رہے گا ؎

یک چراغ است دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری، انجمنے ساختہ اند

کاکا محمد عمر کی وسیع النظری ملاحظہ کیجئے کہ انہوں نے مکانات تعمیر کر کے نصف مسلمانوں کو اور نصف غیرمسلموں کو عطا فرمائے۔ اور ان سے کوئی معاوضہ نہیں لیا بلکہ مکانات مفت عنایت فرمائے۔

اس وادی میں ان کا ایک شاندار ناریل کا باغ بھی ہے جس کی زیارت کا شرف میں چند برس قبل حاصل کر چکا ہوں۔

اس ۵۰ سالہ جشن کے موقع پر جب سارا علاقہ چمن زار بن گیا تھا اور ساری بستی بقعۂ نور نظر آتی تھی۔ ہر جانب سے عمرآباد کی طرف ہجوم تھا۔ بسوں کی بھرمار تھی۔ یوپی کے بڑے میلوں کے مناظر میری نگاہوں میں ابھر رہے تھے ایسے موقع پر جامعہ دارالسلام کی عمارت کے سامنے ایک کونے پر میری نظر گئی، جہاں یہ بزرگ ہستی آسودۂ خواب تھی، میں نے سمجھ لیا کہ اصل جشن کا مرکز تو یہ تودۂ خاک ہے جہاں چراغ بھی روشن نہیں مگر جذبۂ رواں کا یہ عالم ہے کہ اس نے ہزاروں دلوں کو گرما دیا اور دماغوں کو روشن کر دیا ہے۔

جامعہ دارالسلام عمرآباد نے اپنا جشن طلائی بڑے تزک و احتشام سے منایا۔ جنوبی ہند میں اس پیمانے پر علمی اجتماع پہلی بار منعقد کیا گیا جامعہ کے سامنے جو میدان پہاڑی سے ملحق پڑا تھا وہ اچانک ایک دلکش شہر میں تبدیل ہو گیا۔ پورا میدان شامیانوں اور خیموں سے پُر ہو گیا اسلامی فکر۔ رکھنے والے مسلمانوں کی ایک عظیم محفل نظر آنے لگی ہر طرف اسلامی فضا اور اہل علم کی بہار، چہروں پہ نکھار اور عرب مندوبین کی ہلچل، کتابوں کی دوکانیں، شامیانے کی نئی مسجد نیند ال غرض پورا خیموں کا شہر جو قدیم عربوں کی یاد دلاتا تھا اور دل میں ایک عجیب حسن و نور کا عالم پیدا کرتا تھا۔

ایسے مواقع کم آتے ہیں جہاں مذہبی فکر کا علمی مجمع اتنی بڑی تعداد میں اکٹھا ہو۔ عوامی جلسے تو روز ہوتے ہیں۔ یہ جامعہ عمرآباد کا بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے جنوبی ہند کے اسلامی حلقہ کو مل بیٹھنے کا موقع عطا کیا۔

مولانا سید صبغۃ اللہ بختیاری نے فرمایا کہ جب ندوۃ العلماء نے ۱۹۷۵ء میں ۸۵ سالہ جشن منعقد کیا تو کاکا محمد عمر صاحب سکریٹری جامعہ اور ان کے بھائی کاکا سید عمر دونوں نے اس میں شرکت کی اور بڑے غور سے اس کو دیکھا پھر خود بھی دل میں ٹھان لیا کہ اسی انداز کا ایک جشن منعقد کرنا ہے۔ چنانچہ انہوں نے عرب ممالک کا دورہ کیا اور عربوں کو مدعو کیا چنانچہ عرب بڑی تعداد میں شریک جلسہ تھے اور ندوہ ہی کی طرح کاروائی عربی ہی میں ہوتی تھی ترجمہ اردو میں بلکہ ندوہ میں تو اکثر تقریروں کے ترجمے اردو میں نہیں ہوئے مگر یہاں ہر اردو تقریر کا عربی میں اور عربی کا اردو میں ترجمہ کیا گیا۔

شمالی ارکاٹ کا علاقہ جان بہار ہے بلند و بالا ناریل کے درخت، چھوٹے چھوٹے پہاڑ سرخ مٹی، سبزہ زار و ہریالی، عربی اور اسلامی اداروں کی کثرت، مسلمانوں کی عظمت، دولتمند تاجروں کی دریادلی، دلوں کی آسودگی، اردو کی قدردانی اور اسلامی جذبات کی فراوانی اس علاقہ کے مسلمانوں کو امتیاز و افتخار بخشتا ہے۔ یہاں کے ادارے آسودہ حال مسلمانوں کے دلوں کی حرارت سے چلتے ہیں چندوں سے نہیں چلائے جاتے۔ عمرآباد کا مدرسہ بھی اسی طرح کا مدرسہ ہے۔

اپنی عدیم الفرصتی کے باعث پہلے میرا ارادہ اس جشن میں شرکت کا نہ تھا مگر بعد میں دل میں ایک امنگ پیدا ہوئی اور اچانک تیار ہو گیا جلسہ ۱۶، ۱۷ اور ۱۸ اپریل ۱۹۸۰ء تین دن تھا مگر میں دوسرے دن صبح ویلور ریلوے سے پہونچا۔ ڈبے میں مولانا سی۔ این احمد صاحب بھی موجود تھے جنھوں نے قرآن مجید کی تفسیر اور بخاری شریف کی مکمل تشریح ملایالم زبان میں کی ہے۔ ویلور پہونچ کر میں دار العلوم لطیفیہ حضرت کے مکان پر پہونچا۔ سجادہ نشین صاحب سے ملاقات کی۔ پھر حضرت پیر صاحب مہتمم دار العلوم تشریف لائے اور بڑے اصرار سے ناشتہ کرایا۔ دوران گفتگو تذکرہ نکلا باقیات الصالحات کا۔ انہوں نے فرمایا کہ مولانا عبدالوہاب صاحب ان کے مرید تھے اور ترقی کر کے تحصیلدار ہو گئے تھے مگر ان کے مرشد سید شاہ عبداللطیف قادریؒ نے لکھا کہ ملازمت چھوڑ کر ویلور آ جاؤ اور عربی کا مدرسہ چلاؤ۔ ظاہر ہے کہ تحصیلداری کی شاندار جگہ چھوڑ کر معمولی ۴۰ روپے کے ماہوار کے مشاہرے پر آ جانا بقول حضرت پیر انتہائی فرمانبرداری تھی۔ جس کے نتیجہ میں ان کو بقائے دوام کی نعمت نصیب ہوئی۔ میں نے معذرت کرتے ہوئے اجازت چاہی اور عمرآباد روانہ ہوا۔ وہاں پہلے مولانا یوسف کوکن صاحب نظر آئے پھر مولانا بختیاری صاحب نظر آئے اتنے میں ترچی کے میرے ایک شاگرد بشیر احمد بکر شیدا اردو مل گئے چونکہ میں نے اتنک وانم باڑی نہیں دیکھا تھا اس لئے وہاں چلا گیا اسلامیہ کالج اور درسگاہ نسواں بحرخواہ عام کی زیارت کی۔ لوٹا تو آمبور کے ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا تاکہ بھیڑ بھاڑ کی زحمت سے بچ سکوں صبح پھر جلسہ گاہ میں پہونچا۔ اجلاس شروع ہوا مگر تیسرے دن اکثر لوگ جا چکے تھے۔ نہایت افسوس ہوا یہ معلوم کر کے کہ استاذ گرامی مولانا ابوالعرفان ندوی، مولانا اسحٰق جلیس ندوی، ایڈیٹر تعمیر حیات اور مولانا سعید الرحمٰن ندوی تشریف لائے تھے۔ اور دو دن رہ کر چلے گئے میں وانم باڑی نہ گیا ہوتا تو اس ندوی وفد سے ملاقات کر سکتا تھا۔

یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

پھر بھی کئی اشخاص سے دلکش ملاقاتیں رہیں مولانا شہاب الدین ندوی سے ملاقات ہوئی انہوں نے "غذائے فرقان" کا دوسرا شمارہ ہدیۃً عنایت فرمایا۔ میں نے عرض کیا کہ آپ تو جنوبی ہند کے قطب بنے ہوئے ہیں۔

پروفیسر میر محمود حسین صدر شعبۂ اردو و فارسی میسور یونیورسٹی سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے میسور یونیورسٹی میں برسہا برس صرف کر کے جو کتب خانہ بنایا ہے اس پر میں نے ان کو مبارک باد دی۔ واقعی حیدرآباد کے بعد یہ اردو و فارسی کا سب سے بڑا کتب خانہ ہے جو میر صاحب کی غیرمعمولی جفاکشی کا ثمرہ ہے۔

صحیفہ کا جشن نمبر

جامعہ دارالسلام عمرآباد سے ایک زمانہ میں ماہنامہ صحیفہ نکلتا تھا۔ جامعہ کے پاس ایک چھوٹا سا پریس بھی موجود ہے۔ اس مبارک موقع پر جامعہ نے صحیفہ کا جشن نمبر بڑا ضخیم اور دلکش بنا کر شائع کیا۔ اس میں جنوبی ہند کے تمام اہل نظر کے مقالے یکجا کر دئے گئے ہیں اور خود جامعہ کی تاریخ، اس کی تعلیمی ترقی کے مختلف مراحل، اسکے فضلاء اور اساتذہ کی مکمل تفصیل اس صحیفہ میں مل جائے گی۔ یہ صحیفہ جنوبی ہند ہے جس کے آئینہ میں اس دیار میں مسلمانوں کی علمی عظمت کی تابناکی عیاں ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جامعہ کے طلبہ اور اساتذہ میں اردو ادب کا ذوق عام ہے اور ندوہ کی طرح جنوب میں یہ اس کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہے اس جامعہ میں جنوب کے دو شاعر موجود ہیں ایک مولانا ابوالبیان حماد اور دوسرے اثر بخشی نوری، ادب اور دین کا امتزاج ان کی شخصیت کے تار حریر دو رنگ ہیں۔

اس جشن طلائی سے نہ صرف جامعہ دارالسلام کا نام ہندوستان میں مشہور ہوا بلکہ عرب بھی اس مدرسہ سے واقف ہو گئے اور عربی رسالوں میں بھی اس کی خبریں شائع ہوئیں۔

"داتا آباد رکھے ساقی تیری محفل کو"

خط و کتابت کے وقت حوالہ نمبر خریداری ضرور تحریر کریں۔
"مینیجر"

ملفوظات شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ تعالیٰ

خطبات جمعہ تقاریر اور مجالس ذکر میں مولانا کے چند خصوصی ارشادات :۔

★ قرآن کا خلاصہ یہ ہے " اللہ کو عبادت سے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطاعت سے اور مخلوق کو خدمت سے راضی رکھو "۔

★ قرآن مجید کا خلاصہ ہے تعلق باللہ سے وابستگی۔

★ راہ ہے اسلام، راہرو ہے مسلمان، منزل مقصود ہے دربار رحمان۔

★ ہمارے باوا آدم تو انتقال فرما گئے ہیں، مگر شیطان کا باوا ابھی زندہ ہے۔ اسی لئے گمراہی زیادہ عام ہے۔

★ شیطان اس لحاظ سے بڑا عقلمند ہے کہ بڑے بڑے عقلمندوں کو بے وقوف بنا دیتا ہے۔

★ جب مسلمان کو اخلاص اور توکل کے دو پَر لگ جاتے ہیں تو پھر وہ روحانیت کے آسمان پر اڑنے لگتا ہے۔

★ تم نے اپنی اولاد کو ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کرایا، وکالت اور ڈاکٹری پڑھائی لیکن ایسی اولاد کو کیا کرنا اور اس کا کیا فائدہ جس کے لئے تم نے سب کچھ کیا مگر وہ اپنے باپ کے جنازہ پر دعائے جنازہ بھی نہیں پڑھ سکتی۔

★ ولی کبھی مشرک نہیں ہو سکتا اور مشرک کبھی ولی نہیں بن سکتا۔

★ اللہ تعالیٰ تو بڑا نازک مزاج محبوب ہے وہ اپنے تعلق میں غیر کی شرکت برداشت نہیں کر سکتا۔

★ جس طرح ایک مرد اپنی بیوی سے غیر مرد کے تعلقات کو برداشت نہیں کرتا، اسی طرح اللہ تعالیٰ کسی غیر اللہ سے ان تعلقات کو جو اُن سے ہونے چاہئیں، پسند نہیں کرتے، اگر کسی غیر اللہ سے تعلق ہو تو وہ شرک ہے۔

★ غیر اللہ کو سجدے کرنا، ان سے مرادیں مانگنا، انکی قبروں پر چڑھاوے چڑھانا یا مصیبت کے وقت ان سے امداد طلب کرنا بھی شرک ہے۔

★ کافر بتوں کو سجدے کرتے تھے اور آج مسلمان اولیائے کرام کی قبروں پر سجدے کرتے ہیں۔

★ دنیا میں سب طمع کے یار ہیں، بے طمع کا یار صرف اللہ ہے جو سب کچھ دیتا ہے لیکن کچھ نہیں لیتا، پھر بے طمع کے یار حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ شفاعت کے بغیر چین نہیں لیں گے، یا پھر بے طمع کے یار اللہ والے ہیں، باقی سب طمع کے یار، بیوی، اولاد اور برادری۔ اور برادری تو ایسی ہے کہ اگر اپنے بدن کے گوشت کا قیمہ بنا کر انہیں کھلا دیں تو بھی کوئی خوش نہ ہو۔

★ اپنی نشست و برخاست ہمیشہ ان لوگوں میں رکھئے جنہیں دیکھ کر خدا یاد آجائے، ہمیشہ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔

★ والدین کا فرض ہے کہ اپنے بچوں کو دینی تعلیم دیں ورنہ قیامت کے روز ان سے باز پُرس ہوگی اور وہ مجرم ٹھہرائے جائیں گے۔

★ خدا اور اس کے فرمان کو دل سے ماننا اور اس پر عمل کرنا ہی ایمان ہے۔

★ قرآن کی تعلیم سے ہی جرأت ایمانی پیدا ہوتی ہے۔

★ بیماری انسان کی تنبیہ کے لئے ہے۔

★ ایمان کی منڈیاں مسجدیں ہیں۔

★ بد کبھی عزت حاصل نہیں کر سکتے، اور نیک کبھی رسوا نہیں ہو سکتے۔

★ حرام کی کمائی نورِ ایمان کو ختم کر دیتی ہے۔

★ نیک کمائی سے نیک صلاحیت پیدا ہوتی ہے جس کی غذا گندی، اس کے ضمیر کی آواز بھی گندگی سے آلودہ ہوگی۔

★ جو شخص کسی کو فریب نہیں دیتا وہ ہر کسی کے نزدیک عزت حاصل کر لیتا ہے۔

★ صلہ رحمی یہ نہیں کہ جوڑنے والے سے جوڑے بلکہ توڑنے والے سے جوڑے۔

★ ہادی کی آواز پر اگر آپ لبیک نہیں کہہ سکتے تو خدارا اسے تنگ تو نہ کیجئے!

★ یاد رکھئے! اللہ کے نیک بندوں کو جو اذیت دیتا ہے، خدا اس کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔

★ کامل مومن وہ ہے جس کا تعلق خالق اور مخلوق سے ہے، خالق کو راضی کرنا آسان ہے لیکن مخلوق کو بہت مشکل، مخلوق کو خوش کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ان کا حق ادا کر دے اور اپنا حق طلب نہ کرے۔

★ میں بارہا مکہ معظمہ گیا ہوں، اہل اللہ کے جھنڈ کے جھنڈ ہوتے ہیں مگر میں نے حضرت (مولانا سید حسین احمد) مدنی کے مرتبہ کا کوئی ولی نہیں دیکھا۔

★ امراض روحانی کا علم علماء کی صحبت میں ہوتا ہے اور ان سے شفا صوفیائے کرام کی صحبت میں ہوتی ہے، میرے دو مربی ہیں۔ حضرت (مولانا غلام محمد صاحب) دین پوری اور حضرت (مولانا تاج محمود صاحب) امروٹی، دونوں سے میں نے کسی کتاب کا ایک سبق بھی نہیں پڑھا، دونوں کے دروازہ کی گدائی کی، جو کچھ ملا وہ دیا اللہ تعالیٰ نے، لیکن ذریعہ وہ بنے، یعنی ان بزرگوں کے فیض صحبت سے سب کچھ ملا۔

★ میں نے اللہ تعالیٰ سے جو مانگا وہ مجھے دیا، میں اس سے راضی ہوں، جب بلائے میں حاضر ہوں۔

★ پانچ سال ہو گئے ہیں، میں نے درزی کو بلاکر . . . اپنا کفن تیار کرا لیا تھا، میں ہر وقت موت کے لئے تیار ہوں۔

★ میں ہمیشہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری کوئی نماز قضا نہ کرے، اور صبح کا درسِ قرآن مجید کبھی نہ چھوٹے، اللہ تعالیٰ مجھ کو چلتا پھرتا لے جائے، اپنے فضل سے سوء الکبر سے بچائے، مجھ کو چارپائی پر نہ لٹائے تاکہ میرے لئے اور تیمار داروں کے لئے تکلیف کا باعث بنے، صبح کی نماز پڑھ کر درسِ قرآن مجید کے بعد اللہ تعالیٰ مجھ کو دنیا سے اٹھالے، لوگ مجھ کو میانی صاحب میں پہنچا کر ظہر کی نماز واپس آکر باجماعت پڑھیں۔

★ حضرت (مولانا سید حسین احمد) مدنی مرحوم میرے شیخ نہیں ہیں لیکن میں اپنے مشائخ کی طرح ان کا ادب کرتا ہوں۔

★ دل کتنا ہی سخت ہو ذکر الٰہی کی متواتر ضربوں سے نرم ہو جاتا ہے جس طرح سخت پتھر میں پانی کے ٹپکنے سے نشیب پڑ جاتا ہے۔

★ میں آپ کو بیدار کر رہا ہوں، پٹواری سے لے کر گورنر تک آپ کا کوئی بھی خیر خواہ نہیں ہے اگر آپ کا کوئی خیر خواہ ہے تو وہ اللہ والا ہے، جو آپ سے کھانے کو نہ مانگے، دروازہ محمدی کا غلام ہو، اس کے ہاتھ میں قرآن ہو، اور دوسرے ہاتھ میں مشعلِ حدیث خیر الانام ہو اور وہ ان دونوں نوروں کی روشنی میں آپ کی رہنمائی کرے۔

★ اللہ والوں کی صحبت میں استغناء عن الخلق اور احتیاج الی اللہ کی صفات پیدا ہوتی ہیں (لوگوں سے بے نیازی اور اللہ کی احتیاج)۔

★ جو نماز نہ پڑھے وہ بدمعاش، جو روزہ نہ رکھے وہ بدمعاش میں فتویٰ دیتا ہوں جاؤ علماء سے جاکر کہدو احمد علی اس طرح کہتا ہے، عربی میں دو لفظ ہیں فاسق و فاجر — ہماری زبان میں ان کا ترجمہ ہے بدمعاش، وہ بدمعاش ہے جس کی زندگی اسلامی قوانین کے خلاف ہو۔

★ جب لال قلعے دہلی کے سامنے عصمتیں لٹنے لگیں تو اللہ تعالیٰ کو غیرت آئی وہ لاکھوں میل دور سے چوہڑے (انگریز) لایا اور تم پر مسلط کر دئے۔

★ حقوق اللہ اور حقوق العباد پر قرآن مجید سے بہتر کوئی کتاب نہیں بولتی ہے۔

★ تم کو مسجد کی چٹائیوں پر بیٹھ کر قرآن مجید سننے میں عار آتی ہے تو تمہاری کوٹھیوں (بنگلوں) میں چل کر جانا ہمارے جوتے کی بھی توہین ہے۔

★ جو ہنڈیا میں ہو وہی رکابی میں آتا ہے، پیٹ میں حرام ہو تو نیک عمل نہیں ہوتا۔

★ عالم دین ہو، حافظ قرآن ہو، حج بھی کر آیا ہو، زکوٰۃ کی پائی پائی ادا کرے، مر جائے اور ضعیف والدین ہاتھ اٹھا کر بد دعا کریں کہ الٰہی ہم تو اس پر راضی نہیں ہیں تو اس پر جنت کے آٹھوں دروازے بند اور اس کو جہنم میں دھکیل دیا جائے گا۔

★ تم ایک دانہ زائد نہیں کھا کر مرو گے اور نہ ہی ایک دانہ چھوڑ کر مرو گے، رات دن روٹی روٹی کی پکار ہے۔

★ میں نے اپنے تینوں بیٹوں کو تین وصیتیں کی ہیں :۔

(۱) کیمیاگری میں مبتلا نہ ہونا (۲) عملیات کے پیچھے نہ پڑنا اور (۳) کسی کی ضمانت نہ دینا، کیونکہ خواہ مخواہ کسی نہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ گے اور اس طرح سے دین کی خدمت میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔

مقدمہ کتاب " شرقِ اوسط کی ڈائری "

★ ——— (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

عربی زبان میں " مذکرات سائح فی الشرق العربی " کے نام سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بیش بہا سفرنامے اور روزنامچے کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، اس سفرنامے میں سنہ ۱۹۵۱ء کے سفر مصر، سوڈان اور شام کی روداد قلمبند ہے۔

اس سفرنامے میں مرد مومن کی فراست، عالم ربانی کی احتیاط و توازن، داعی کا جوش و ولولہ اور ایمانی غیرت، مفکر کی بالغ نظری اور ایک پختہ کار قائد و رہنما کی دوربینی و بصیرت سطر سطر سے جھلکتی ہے۔ اس کا سلیس و شیریں اردو ترجمہ، مولانا شمس الحق صاحب ندوی استاد دار العلوم ندوۃ العلماء نے کیا اور مکتبۂ فردوس نے " شرقِ اوسط کی ڈائری " کے نام سے بڑے اہتمام سے شائع کیا — اس اردو ایڈیشن کا پُرمغز اور معلومات افزا مقدمہ جو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے اپنے قلم سے ہے نذرِ قارئین ہے۔

عربی کتب خانہ میں (بشمول قدیم و جدید) سفرناموں اور سیر و سیاحت کی کتابوں کی کبھی کمی نہیں رہی، عرب اور مسلمان کثرت اسفار میں ہمیشہ دوسری قوموں سے ممتاز رہے، خطر پسندی اور مہم جوئی ان کی فطرت میں شامل تھی۔ ان میں بڑے بڑے سیاح اور حوصلہ مند انسان پیدا ہوئے، ان سفرناموں میں ابن جبیر اندلسی (م ۶۱۴ھ) اور ابن بطوطہ مغربی (م ۷۷۹ھ) کے سفرنامے سب سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان دونوں سفرناموں نے اس وقت کے عالم اسلام اور اسلامی معاشرہ کی پوری تصویر ہمارے لئے محفوظ کر دی ہے۔ اور اپنے زمانہ کی شخصیات کا سراپا ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ یہ وہ تصویریں اور خاکے ہیں جن سے وہ کتابیں بالعموم خالی ہوتی ہیں جن کا تعلق سرکار، دربار، رزم و بزم کے افسانوں، سیاسی انقلابات اور خانہ جنگیوں سے ہوتا ہے، تذکرے کی ان کتابوں میں جو علماء و مشائخ اور مناقب و فضائل سے تعلق رکھتی ہیں، زندگی کا یہ عنصر بہت کم ملے گا۔

ایسی کتابیں بہت کم ہیں جن میں قلبی واردات اور احساسات و خیالات کی صحیح ترجمانی کی گئی ہو، اس سلسلے میں یہ دو کتابیں ضرور قابل ذکر ہیں جن میں انسانی احساسات اور نازک خیالات کی پوری عکاسی موجود ہے، اور ان میں خفی سے خفی احساس اور روزمرہ کی زندگی کے تجربات کو ریکارڈ کیا گیا ہے۔ ان میں ایک امام غزالیؒ (م ۵۰۵ھ) کی کتاب " المنقذ من الضلال " اور دوسرے ابن جوزی (م ۵۹۶ھ) کی کتاب " صید الخاطر " ہے۔

ان کتابوں کی علمی قیمت و افادیت اور ان کے مصنفین کے علم و فضل کے اعتراف کے باوجود اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ جس زندگی اور جس معاشرہ اور ملک کی انہوں نے آئندہ نسلوں کے لئے تصویر کشی کی ہے وہ ایک سادہ، محدود، اور پرسکون زندگی تھی، جس میں کوئی وسعت، تنوع، پیچیدگی اور دشواری نہ تھی، اس میں موجودہ زندگی کا تجدد و تنوع نہ تھا، یہ پورا دور فکری تحریکات، سیاسی انقلابات، متنوع اداروں اور جماعتوں، برسر پیکار فلسفوں اور متضاد شخصیتوں سے ناآشنا تھا۔ ان کے عہد میں زندگی کا صرف ایک رنگ، ایک آہنگ اور ایک تصویر پائی جاتی تھی، اس لئے ان کا کام آسان تھا، جس میں ایک اسلوب کو چھوڑ کر دوسرا اسلوب اختیار کرنے اور ایک فضا سے دوسری فضا میں منتقل ہونے یا نیا راستہ اختیار کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔

دوسری بات یہ کہ یہ کتابیں ان اسفار و مشاہدات و تاثرات کے بہت زمانہ بعد یا کسی امیر یا وزیر کی فرمائش پر لکھی یا املا کی گئیں۔ اگر واقعات کو قلمبند کرنے اور مقامات کی تعیین میں حافظ کی قوت تسلیم بھی کر لی جائے (اگرچہ بعض ناقدین کو ان تفصیلات کی صحت پر شبہ ہے) تب بھی اس بات میں شبہ نہیں کہ ان تاثرات (جو سایۂ دیوار یا موجِ آب کی طرح ناپائدار ہوتے ہیں) پر پورا اعتماد نہیں کیا جا سکتا، انسان بروقت اپنے کسی تاثر کو قلمبند کر سکتا ہے، لیکن کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد محض اپنے حافظہ کی مدد سے اس کی تجدید اور مسرت و الم اور انقباض و انشراح کی جو کیفیات اس پر گذر چکی ہیں اس کو ریکارڈ کرنا، اس کے لئے آسان نہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ روزنامچہ لکھنے کا طریقہ پہلے زمانہ میں زیادہ رائج نہ تھا، اس کا رواج ان سیاحوں اور مصنفوں کے بہت بعد ہوا، اگر کہیں ایسا ہوا بھی تو وہ قارئین کے ہاتھوں میں نہ پہنچ سکا۔

موجودہ زمانے میں نشر و اشاعت کی سہولتوں سفر کی آسانیوں، سیر و سیاحت کی ہمت افزائی اور اسباب و وسائل کی فراوانی کی وجہ سے سفرنامے بڑی تعداد میں لکھے گئے، لیکن یہ سفرنامے زیادہ تر علمی و جغرافیائی و فوائد و معلومات پر مشتمل تھے، وقت گزاری اور تفریح کا مواد اس میں خاصا موجود تھا، اور باوجود اس کے کہ اس سے زندگی کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی تھی، تاہم ان کا مرکزی نقطہ سیر و سیاحت، آثار قدیمہ و قابل دید مقامات کی عکاسی رہا، اور اگر زندگی کے کسی پہلو کی اس میں عکاسی ملی بھی تو بہت واجبی حد تک اور صرف اتنی جو مصنف کے دائرۂ ذوق میں آتی ہو، یا اس کے سفر کے ساتھ ہم آہنگ ہو، مثلاً اگر یہ سیاح ادیب تھا تو اس نے مشاہیر ادب کے تذکرے یا اس ملک کی ادبی سرگرمیوں کے ذکر پر اکتفا کی۔ اور اگر یہ مذہبی آدمی تھا تو اس نے دینی حالات پر پوری تفصیل سے کلام کیا۔ اگر وہ کوئی سیاسی یا منتظم تھا تو اس نے سیاسی شخصیتوں کے تذکرہ اور سیاسی تحریکوں اور مکاتب خیال کی تصویر کشی میں سفرنامہ کا بڑا حصہ صرف کر دیا۔

اس کے علاوہ اکثر یہ کتابیں جذبہ اور عقیدہ سے خالی اور لطیف احساسات سے عاری ہوتی ہیں، اور ان کے مصنف ان میں کیمرہ یا ریکارڈ کا کردار ادا کرتے ہیں۔ واقعات و مشاہدات پر خود کوئی تبصرہ نہیں کرتے۔ اس میں انکے دل کی کوئی دھڑکن اور ان کے ضمیر کی کوئی سرگوشی نہیں سُنی جا سکتی، چنانچہ اگر کتاب کے سرورق پر ان کے نام کے بجائے کسی ایسے مصنف کا نام لکھ دیا جائے جس کا اس معاشرہ کے ساتھ نہ ثقافت کا کوئی تعلق ہو نہ عقیدہ اور مذہب اور جذبہ اور وجدان کا کوئی اشتراک ہو تو اس سے صورت حال میں کوئی فرق واقع نہ ہوگا، ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ اس کو وجہ فضیلت و کمال سمجھتے ہوں، لیکن بہت سے علماء ادب اس کو عیب اور نقص قرار دیں گے اس لئے کہ جس تحریر سے قاری کو مصنف کے زمان و مکان کا بھی پتہ نہ لگے، نہ مصنف کا عقیدہ اور مذہب و مسلک اس کو معلوم ہو سکے نہ اس کی محبوب قدروں اور آئیڈیل شخصیتوں کا اسے علم ہو، نہ اس کی گرمجوشی اور قوت مدافعت کا اندازہ ہو، اس کی ان تحریروں میں حزن و الم کی تلخ کلامی اور مسرت و شادمانی کی حلاوت محسوس نہ ہو تو وہ ایک مصنوعی اور بے جان تحریر ہے، جو نہ کسی کے دل پر اثر کر سکتی ہے اور نہ زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

مصنف کتاب کو ۱۹۵۱ء کے آغاز میں شرق اوسط کے سفر کا موقع ملا، اور ان ممالک کے دینی، علمی و اجتماعی حالات کا مطالعہ کرنے، وہاں کی اہم شخصیتوں سے ملنے اور ان کے ساتھ مختلف دینی و علمی موضوعات، اسلامی مسائل، اصلاحی تحریکات اور تعلیمی منصوبوں پر گفتگو کرنے کی نوبت آئی، انہوں نے ان سے اپنے ملک ہندوستان کا تعارف کرایا جس پر ناواقفیت کے دبیز پردے پڑے ہوئے تھے اور جو ایک طویل زمانہ سے عالم عربی سے منقطع تھا، نیز دعوت و اصلاح کے وہ تجربے ان کو عالم عربی کے افکار و نظریات، اصلاحی تحریکات اور اہم شخصیات سے استفادہ اور وہاں کے فکری و ادبی مکاتب خیال اور نئے نئے مسائل کو سمجھنے اور فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔ خدا کی توفیق سے ان ممالک کے سفر سے پہلے مصنف کا علمی و ادبی اور ذہنی سانچہ بن چکا تھا اس کی ثقافت ہمہ رنگ اور متنوع تھی۔ اس کی شخصیت مختلف عناصر سے مرکب تھی، اس کو ادب، شعر و شاعری، تاریخ، علوم اجتماعی، تہذیب و تمدن اور فلسفۂ حیات جیسے مضامین سے دلچسپی تھی اور عملی زندگی کا بھی تجربہ تھا، درس و تدریس اور تصنیف و تالیف دونوں چیزوں سے اس کا اشتغال رہا تھا، مصر و شام کے مختلف مدارس فکر اور دبستان ادب سے اس کی شناسائی تھی، اس نے ان ممالک کا سفر علی وجہ البصیرت اور پوری واقفیت پر مبنی تھا، اور گویا صرف ملاقات کی کسر تھی، اسی کے ساتھ اللہ کی مشیت یہ ہوئی کہ یہ سفر مصنف کی سب سے مشہور کتاب " ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین " کی اشاعت کے بعد ہوا جس کی وجہ سے مصنف کا اسلامی حلقوں میں اچھا تعارف ہو چکا تھا۔ یہ سب باتیں تھیں جن کی وجہ سے نووارد سیاح کو وہاں کے دینی و علمی ماحول میں داخل ہونے کا پورا موقع ملا۔ اس نے وہاں ہر چشمۂ علم سے فیض اٹھایا، رجال کے ہر طبقہ سے تعلق رکھا، ہر علمی بحث میں پورا حصہ لیا، ہر موضوع پر کھل کر گفتگو کی، اس نے فائدہ اٹھایا بھی اور فائدہ پہونچایا بھی، لیا بھی اور دیا بھی۔

اس نے اس سفر میں اس کا التزام کیا کہ ہر گفتگو، ملاقات، تاثر و مشاہدہ کو زیادہ تر روز کا روز قلمبند کر لیا جائے، اور نقل و اقتباس اور روایت میں اس کا خاص خیال رکھا جائے اور اس کا اہتمام کیا جائے کہ جو الفاظ اور جو صیغے متکلم نے استعمال کئے وہی الفاظ حتی الامکان باقی رکھے جائیں، اسی لئے اس کتاب میں مقامی اسالیب و ادب کا پورا عکس آ گیا ہے، جس سے موجودہ عہد

بعد میں استفادہ کر سکتے ہیں، کتاب کے قارئین اس روزنامچہ میں بہت سی شخصیات کے حقیقی خد و خال کو نمایاں دیکھ سکیں گے اور ان کے سامنے وہ ماحول (جس میں یہ روزنامچہ لکھا گیا ہے) اپنی پوری کشمکش اور تلاطم کے ساتھ آجائے گا، جس میں نفسیاتی، فکری اور اجتماعی اضطراب بے چینی کا عنصر نمایاں تھا، بلکہ اسمیں ان واقعات کی بھی عکاسی یا پیشین گوئی ملیگی جن کی صرف علامات نظر آرہی تھیں۔ ان شخصیات کو بھی دیکھا جاسکے گا جو ابھی پردے کے پیچھے تھیں اور ان دور رس تبدیلیوں کو بھی جن کے دھندلے اشارے افق پر ظاہر ہوئے تھے، اس لحاظ سے یہ روزنامچہ زندہ اور بولتی ہوئی تصویروں کا البم ہے جس کے ذریعہ قاری ایک ایسے دور میں کچھ وقت گذار سکتاہے جو اب واپس آنے والا نہیں۔

اس میں مصنف نے اس بات کا بھی التزام کیاہے کہ کسی ملاقات، گفتگو اور مشاہدہ کے سلسلے میں اپنے افکار و خیالات اور تاثرات بے کم و کاست بیان کردے۔ اور اس واقعہ کا جو ردِ عمل یا انفعالی تاثر اس پر پڑاہے اس کو بغیر کسی ابہام و تحفظ اور بغیر کسی مجاملت اور تکلف کے بہت صاف اور واضح طریقہ پر قلمبند کردے۔ یہ ایک زندہ انسان کی تصویر کشی اور منظر نگاری ہے جو اپنے سینہ میں دل رکھتاہے، جس کے کچھ عقائد، اصول اور اقدار ہیں، جن پر وہ عقیدہ رکھتاہے، جس کو ان ملکوں سے محبت بھی ہے، جو ان کے ماضی، حال اور مستقبل تینوں سے وابستہ ہے، اور اپنے کو ان کے خاندان کا ایک فرد تصور کرتاہے، جو ان کے رشد و فلاح اور کامیابی و ناکامی ہر چیز میں شریک اور حصہ دار ہے، جس کے نزدیک اسلام (جس سے اللہ تعالیٰ نے ان ملکوں کو سرفراز فرمایا اور دنیا میں اس کی اشاعت کے لئے ان کا انتخاب کیا) ہر چیز کا اصل پیمانہ اور معیار ہے، اور اعمال، اخلاق، اور شخصیات سب کو اسی پیمانہ سے ناپنا چاہیئے، اس کتاب کی وہ خصوصیت ہے جس کے لئے مصنف کو کسی معذرت کی ضرورت نہیں، پھر ان ملکوں سے جدا ہوتے وقت وہ ان پر ایک وداعی اور اجمالی نظر ڈالتاہے، اور اس کے محاسن اور کمزور پہلو دونوں کو اجاگر کرتا ہے، جو چیزیں اس کو اچھی معلوم ہوتی ہیں اور جو چیزیں اس کو رنجیدہ کرتی ہیں جن چیزوں کو وہ ملک کے لئے خطرناک سمجھتاہے یا جن سے اس کی طبیعت متنفر ہوتی ہے وہ سب اس میں بے کم و کاست پوری امانتداری کے ساتھ بیان کردیتاہے۔ قطع نظر اس کے کہ یہ باتیں اس کے دوستوں اور محبین کو پسند آئیں گی یا ان کی ناپسندیدگی و ناراضی کا باعث بنیں گی۔ اس لئے کہ ایک عربی شاعر نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ:۔

٭ في القتاب حياة من اقوام
٭ شکوہ اور اظہار ناگواری قوموں کی زندگی

اور زندہ دلی کی علامت ہے"

اس کتاب کا پہلا اڈیشن ۱۹۵۴ء و ۱۳۷۳ھ میں مذکرات سائح في الشرق العربي کے نام سے جامعۃ الازہر للتالیف والترجمہ والنشر کی طرف سے شائع ہوا، اس کا مقدمہ مصنف کے فاضل دوست اور ازہر کے رکن رکین ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ نے لکھا، اور مکتبۂ وہبہ قاہرہ نے اس کو شائع کیا لیکن یہ اڈیشن طباعت کی اغلاط سے پُر تھا، اور اس کی طباعت و تصحیح کا کچھ زیادہ اہتمام نہیں کیا گیا تھا مصنف کی ہر کتاب کے کئی اڈیشن نکلے سوائے اس کتاب کے جس کا اب تک صرف ایک ہی اڈیشن نکل سکاہے۔ اس درمیان میں مصر میں بہت سی سیاسی تبدیلیاں واقع ہوئیں جن کی وجہ سے وہاں اس کی اشاعت کی نوبت نہ آسکی، جب مصنف کو علم ہوا کہ بعض ناشر اس کو دوبارہ چھاپنا چاہتے ہیں تو اسے شبہ تھا کہ اب کتاب کی افادیت باقی بچی یا نہیں، اس کو اندیشہ تھا کہ اتنا پر آشوب زمانہ گذرنے کے بعد اس کی اہمیت افادیت اور زندگی ختم یا کم ہوچکی ہوگی۔ لیکن جب مصنف نے کتاب کو دوبارہ اس نظر سے دیکھا تو اسکو اندازہ ہوا کہ یہ کتاب دراصل ایک تاریخی دستاویز ہے جو بجائے خود بڑی قیمت کی حامل ہے اس لئے کہ دستاویزات کی قیمت و اہمیت مرور زمانہ سے گھٹتی نہیں بلکہ بڑھتی ہے۔ اس لحاظ سے جتنا زمانہ گذرے گا۔ اور وہ ماحول جتنا ہم سے دور ہوگا جس میں یہ روزنامچہ قلمبند کیا گیا اسی کے بقدر ان معلومات اور نقوش و تاثرات کی قیمت میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ اس میں ناظرین کو انسانی چہروں کے وہ خد و خال اور پیشانیوں کی وہ تحریریں صاف نظر آئیں گی جو اس کو تاریخ کی کسی کتاب میں دستیاب نہیں ہوسکتیں، اس کو اس میں مشاہیر عالم ارباب فکر و دانش، مصلحین اخلاق، ائمہ علم اور صاحب طرز ادیبوں کے وہ اعترافات و بیانات ملیں گے جو اس کو خود ان کی تصنیفات اور روزنامچوں میں نہیں مل سکتے ہوسکتاہے کہ کسی اسکالر اور مورخ کو صدیوں کے بعد اس سے کوئی ایسی کڑی دریافت ہو جس سے واقعات کی پوری زنجیر مکمل ہوجائے اور وہ خلا پُر ہوجائے جس نے اس کو اپنے کام سے مایوس کردیا تھا۔ مورخ بظاہر ان غیر اہم واقعات، گفتگوؤں، ملاقاتوں اور مشاہدات سے بعض اوقات وہ نتائج اخذ کرسکتے ہیں اور ان سے وہ استفادہ کرسکتے ہیں جو تراجم و تذکرے کے ہزاروں صفحات اور جرائد و مجلات کی ضخیم فائلوں کی ورق گردانی سے ان کو حاصل نہیں ہوسکتا اس بنیاد پر مصنف نے کتاب کی دوبارہ اشاعت کی منظوری دیدی، قارئین کتاب کی ان شخصیات کے بارے میں جواب پردہ خفا میں چلی گئی ہیں یا

جن کو سیاسی انقلاب نے گوشۂ گمنامی میں پہونچا دیاہے، صحیح اور بے لاگ رائے قائم کرسکتے ہیں نیز ان شخصیتوں کو جنھیں (بعض اہل قلم اور ادبا و مصنفین نے ضرورت سے زیادہ حق دے رکھا ہے یا جن کو پروپیگنڈہ کے زور سے شہرت حاصل ہوگئی ہے) اپنی صحیح اور اصل جگہ پر دیکھ سکتے ہیں اور بہت تھوڑی فرصت میں ان سے ضروری فائدہ اٹھا سکتے ہیں اس لئے کہ انسانی زندگی کے جو تجربے ان کو حاصل ہوئے اور جن نتائج تک ان کی رسائی ہوئی وہ انسانیت کی دولتِ مشترکہ ہے جس سے ایک کے بعد دوسری نسل برابر فائدہ اٹھاتی رہی ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ "حکمت مومن کا گمشدہ مال ہے جہاں بھی وہ اس کو ملے وہ اس کا سب سے زیادہ حقدار ہے"۔

آخر میں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مصنف کو اس دورہ میں لبنان جانے کا موقع نہ مل سکا، یہ سفر ۱۹۵۶ء میں مقدر تھا اس میں بھی اس نے گذشتہ دورہ کی طرح روزنامچہ لکھنے کا التزام کیا اور یہ روزنامچہ "ثلاثۃ ایام فی لبنان" کے عنوان سے ندوۃ العلماء کے عربی ماہنامہ "البعث الاسلامی" میں شائع ہوا، سفر کے اختتام کے طور پر یہ مختصر مقالہ کتاب کے آخر میں شامل کردیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب سے نفع عام حاصل ہو جس کے لئے مصنف نے سفر کی صعوبتیں برداشت کیں اور تنگی وقت اور شدید مصروفیت کے باوجود معلومات و تاثرات کو بہت فکر و اہتمام اور دلچسپی کے ساتھ قلمبند کیا۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔

نعت

ڈاکٹر سید طفیل احمد مدنی

میں ہوں غلام اس شہِ عالی مقام کا
ادراک کیا کرے گا کوئی اس مقام کا

لطف و کرم کا ان کے کروں کس طرح بیاں
توحید کے مزے سے کیا آشنا ہمیں

پہونچائے خود کو ساقیٔ کوثر کے سامنے
ہر امتی کو ملتاہے جام مئے طہور

ہر سمت شرق و غرب میں دیکھے عدو دیں
پہونچادے بابِ ساقیٔ کوثر پہ اے صبا

کہنا یہ دست بستہ کہ اے سید الرسل
چودہ برس ہوئے کہ تڑپتا ہے ہند میں

بلوائیے مدینے میں اک بار پھر حضور!!
یارب جنابِ سرورِ عالم پہ حشر تک

ناپید ہیں عرب سے صنم آج تک طفیل

شہرہ ہے آسمان پہ بھی جس کے نام کا
محمود جزو خاص ہو خود جس کے نام کا

عاجز ہے نطق تنگ ہے دامن کلام کا
احسان کیا یہ کم ہے رسولِ انام کا

طالب ہو جو کوئی مئے کوثر کے جام کا
اٹھتا نہیں سوال وہاں خاص و عام کا

جھنڈا گڑا ہوا ہے محمد کے نام کا
پیغام ایک تشنہ لب و تشنہ کام کا

طالب ہے ایک مسلم ہندی بھی جام کا
ہو حکم اب حضوریٔ دار السلام کا

رکھ لیجئے خدا کے لئے دل غلام کا
رکھ یونہی سلسلہ یہ درود و سلام کا

اعجاز ایک یہ بھی ہے خیر الانام کا

نعت

نظیر صفی پوری

طرزِ نعت میں ہم نے عرضِ دل گذاری ہے
جاہِ احمدِ مرسل، حسنِ سیدِ عالم

بخششوں کی ضامن ہے آپ سے محبت ہی
آپ ہی وہ رہبر ہیں جن کی رہنمائی میں

نور کا خزانہ ہے خاک میں مدینے کی
کاش دیکھ لیتے ہم جاکے وادیٔ زمزم

چھین کر آنا مجھ سے بخش دے رضا اپنی
آپ کے صحابہ کے نقشِ پا کا کیا کہنا

آرزو کے پودے ہیں نور کی کیاری ہے
کیا بیاں کیا جائے ہر زبان عاری ہے

آپ کی غلامی ہی اہلِ دل کو پیاری ہے
حق کو ہم نے پہچانا یہ بھی فیضِ باری ہے

اس کے ذرہ ذرہ پر آفتاب واری ہے
رحمتوں کا سرچشمہ جس جگہ سے جاری ہے

یہ سنا ہے ایماں کی روح انکساری ہے
اُن کی ضو نے عالم کی زندگی سنواری ہے

ق ۔ ب

عرش کے خلاؤں میں دور تک فرشتے ہیں
اک ندائے نورانی منتظر ہے پردوں میں

وہ تو سرد کردے گا آگ بھی جہنم کی
اے نظیر حالِ دل خوب جانتے ہیں وہ

پھول فرشِ منزل ہیں نور کی سواری ہے
یہ سفر کا موسم بھی کتنا یادگاری ہے

جس کو آپ کے غم میں آنسوؤں سے یاری ہے
نعت کے بہانے سے التجا نگاری ہے

حریت و عبودیت

(عربی سے ترجمہ)

برجیس احمد دربھنگوی ندوی

از مصطفیٰ سباعی مرحوم

٭

اکثر لوگوں کا یہ خیال کہ آزادی کا انحصار اس بات پر ہے کہ لوگوں کو اپنا کھویا ہوا حق سیادت واپس مل جائے، صحیح نہیں۔ یہ سیاسی آزادی ہے، لیکن اس سے آگے آزادی کی ایک اور منزل آتی ہے اور وہ ہے فکر و ثقافت اور انسانی رجحانات و خیالات کی آزادی ــــ یہی آزادی جب کسی قوم کی زندگی میں داخل ہوتی ہے تو وہ صحیح معنوں میں آزاد و خوش قسمت قوم کہے جانے کی مستحق ہوتی ہے۔

حریت درحقیقت یہ نہیں (جیسا کہ اکثر و بیشتر نوجوانوں کی رائے ہے) کہ آدمی اپنی خواہشات کا تابع ہو کر رہ جائے، جو جی میں آئے کھائے، جو چاہے کرے اور (اپنے جائز و ناجائز) ہر مقصد کی کامیابی کے لئے کوشاں رہے، کیونکہ اولاً تو یہ ایک قسم کی انارکی و لاقانونیت ہے، اور ثانیاً انتہا درجے کی غلامی اور ذلت و رسوائی۔

۱۔ یہ لاقانونیت تو اس لئے ہے کہ دنیا میں اس قسم کی کوئی ایسی آزادی نہیں جس کا کسی قانون یا نظام سے تعلق نہ ہو، بلکہ دنیا کی ہر چیز کے لئے ایسا نظام قانون یقیناً موجود ہے جو اسے منظم طور پر چلاتا ہے ــ کیونکہ فرد کی حفاظت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اسے دوسرے لوگوں کی آزادی برقرار رکھنے کی خاطر مقید نہ کردیا جائے یہیں سے شرعی احکام، ملکی دستور اور قومی و ملی تنظیم و قوانین کی حکمت کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھو، جیسے بڑے شہروں میں ٹریفک کا قانون ہے، کیا تم مخالف سائڈ میں اپنی گاڑی چلا سکتے ہو جس میں قانوناً تم کو نہیں چلانی چاہیئے؟ ــ یا جیسے راحت عامہ کا قانون، کیا آدھی رات کے بعد تم ان سڑکوں پر گانا گا سکتے ہو جن پر لوگ رہ رہے ہیں؟ اسی طرح حفاظت آزادی کا قانون لے لو، اس کے ہوتے ہوئے کیا تم لوگوں میں اپنی کسی ایسی رائے کا اظہار کرسکتے ہو جس سے نقضِ امن ہوتا ہو اور ملک کی سلامتی خطرے میں پڑ جائے؟ ــ کیا تم ایسے وقت میں (جب کہ تمہاری قوم میدان کارزار میں برسرپیکار ہو) دشمن کے ساتھ صلح کی دعوت اور پیغام دے سکتے ہو؟ . . . . . کیا تم دشمنوں کے ساتھ تجارتی معاملہ یا ملکی برآمدات کی اسمگلنگ کرکے اس سزا سے بچ سکتے ہو جو کبھی کبھی موت کی حد تک پہونچ جاتی ہے؟

نہ صرف آزادی، بلکہ کمال آزادی کا حصول (درحقیقت) کبھی کبھی کسی پابندی ہی کی وجہ سے ہوتا ہے، جیسے مریض کو مضر رساں چیزوں کے کھانے سے روک کر اس کی آزادی کو وقتی طور پر خاص قسم کے کھانے کے اندر اس لئے محدود کردیا جاتا ہے تاکہ آئندہ من مانی اور مرغوب کے اندر اس کی آزادی محفوظ رہے اسی طرح مجرم کو قید کرکے اس کی آزادی اس لئے مقید کردی جاتی ہے تاکہ اسے معلوم ہوجائے کہ اس کے بعد اسے اپنی آزادی کا استعمال کہاں، اور کس طرح کرنا چاہیئے، جس سے دوسروں کو اور خود اس کی ذات کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہ پہونچے۔

چونکہ انسان فطری طور پر مدنی الطبع واقع ہوا ہے اور یکہ و تنہا زندگی گزارنا اس کے لئے محال ہے، لہٰذا وہ ایک ایسی ملی جلی اور مخلوط سوسائٹی کے ایک فرد کی حیثیت سے اپنی زندگی بسر کرتا ہے جہاں آپس میں ایک دوسرے کو اذیت و تکلیف بھی پہنچتی ہے آنحضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس سلسلے میں ایک شاندار اور بڑی عمدہ مثال ایسے لوگوں کی بیان فرمائی ہے جو ایک جہاز میں سوار ہیں، ان میں سے کچھ لوگ بالائی حصے میں ہیں اور کچھ لوگ زیریں حصے میں ــ نیچے والے اوپر والے سے پانی حاصل کرتے ہیں، اس لئے انہوں نے سوچا، کیوں نہ ہم اپنی جگہ سوراخ کرکے براہ راست دریا سے پانی حاصل کریں ــــ آپ نے فرمایا اگر انھیں اُن کے ارادوں پر چھوڑ دیا گیا تو سب کے سب ہلاک ہوجائیں گے، اور اگر ان کے ہاتھ تھام لئے گئے تو سب کی جانیں بچ جائیں گی۔

سب سے بڑے معلم انسانیت کی بیان کردہ یہ مثال، شخصی و فردی بے ضرر آزادی اور اس آزادی کے درمیان ایک حدِّ فاصل کی حیثیت رکھتی ہے جو (اگر آزاد پسند لوگوں کو ان کی مرضی کے مطابق چھوٹ دے دی جائے تو) معاشرے میں بگاڑ پیدا کردیتی ہے اور اسے پستی کی طرف لیجاتی ہے۔

۲۔ یہ آزادی درحقیقت غلامی اسلئے ہے کہ مکمل آزادی تو یہ ہے کہ جو آدمی انسانیت میں تمہارے برابر یا کم درجے کا ہو وہ تمہیں اپنا غلام اور تابع نہ بنائے ــ اور لاقانونیت (جسے کچھ شخصی آزادی سے بھی تعبیر کرتے ہیں) کے اندر وسائل حیات اور اخلاقی قدروں کے اعتبار سے تمہارے برابر یا کم حیثیت کے لوگوں کے لئے غلامی و رسوائی کے سوا کچھ نہیں۔

انسان پر جب ہر خواہش و لذتِ نفس کے پیچھے چلنے اور ہر قید سے گریز کی عادت (بد) غالب آجاتی ہے، تو وہ ہر طور خواہش نفس کا بندۂ بے دام ہو کر اسی کے ماتحت اپنی زندگی بسر کرتا ہے اور اسی کی ہدایات پر عمل پیرا ہوتا ہے یہاں تک کہ اس سے رہائی کی اس میں سکت تک باقی نہیں رہ جاتی ــــ اس کے باوجود یہ آزادی (جو اصلاً غلامی ہے) اخلاقی و مقصدی زندگی سے کیا اچھی کہی جاسکتی ہے؟

. . . . . اگر انسان کی قدر و قیمت حصولِ لذائذ کی مقدار پر منحصر ہوتی تو جانور کہیں اس سے قدر و قیمت میں بڑھکر ہوتے، کیونکہ جانور اپنی خواہشات کے پیچھے بلا روک ٹوک اور بغیر کسی مقصد کے دوڑتے پھرتے ہیں، لیکن انسان جب بھی اپنے مقاصد کے حصول کی کوشش کرتا ہے تو اس کی راہوں میں (اس کے نہ چاہتے ہوئے بھی) کچھ ایسے موانع پیش آجاتے ہیں جو اس کو اس کے مقاصد سے روک دیتے ہیں لہٰذا اس بنا پر کیا کسی کو یہ وہم بھی ہوسکتاہے کہ جانور (جن کے مقاصد کی راہوں میں کوئی مانع در پیش نہیں آتا) انسان سے زیادہ آزاد اور خوش قسمت واقع ہوئے ہیں۔

آدمی اپنی محبوبہ یا جن حسین و خوبصورت عورتوں کے پیچھے تسکین نفس کی خاطر مارا مارا پھرتا ہے اور ہر وقت جن کے لب و رخسار اور گیسوئے شب تار کا ذکر ورد زبان ہوتا ہے، کیا وہ ان کے دام فریب اور فسوں کاری و عشوہ گری سے آزادی کا خیال بھی کرسکتا ہے کیا ہمیں شب و روز اس کا مشاہدہ نہیں ہوتا کہ وہ عقل و خرد سے بیگانہ ہو کر ان خوش اندام نازنینوں کے ایک جنبشِ نگاہ پر محو رقص ہوتا ہے اور اپنا سارا سرمایۂ حیات ان کی چرنوں میں ڈالدینا اپنے لئے قابل صد افتخار اور حاصل زندگی سمجھتا ہے؟ . . . . . اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچھڑے ہوئے محبوب کے ہونٹوں پر دلفریب و جاں نواز مچلتے ہوئے تبسم کا نظارہ کرے یا اس کے حسین و مرمریں جسم کے لمس سے محظوظ ہو، جس کی بھینی بھینی خوشبو مشام جاں کو تازگی بخشتی ہے ــــ بتلاؤ اس سے بڑھ کر اور کون سی غلامی ہوسکتی ہے کہ وہ اپنی پسند و ناپسند، وصل و ہجر، خوشی و ناخوشی سکون و اضطراب میں بھی آزاد نہیں رہ جاتا؟

آدمی کو جب مسکرات و منشیات کے استعمال کی چھوٹ مل جاتی ہے تو وہ اس کا استعمال اس حد تک کرنے لگ جاتا ہے کہ اس کے اعصاب بیکار ہوجاتے ہیں، صحت بگڑ جاتی ہے، شرافت و کرامت سب خاک میں مل جاتی ہے اور عقل و خرد کی جنس بہا دولت بھی جاتی رہتی ہے، اس کے باوجود بھی یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ آزاد ہے؟ ــ کیا اس مہلک شراب اور سم قاتل کی یہ عادت بد کسی بدترین قسم کی غلامی سے کم ہے؟

بالآخر تردید ہم نہایت وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ حبِ مال و جاہ اور وطن پرستی و قوم پرستی بھی اسی قبیل کی چیزیں ہیں، جب ان کا کسی کے دل پر تسلط ہوجاتا تو ان کے اثرات اس آدمی کے اعمال و سلوک پر بھی پڑتے ہیں اور وہ بدترین قسم کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا جاتا ہے ــــ قرآن مجید نے اس حالت کی بڑے دلنشیں انداز میں تصویر پیش کی ہے۔

"أفرأیت من اتخذ الٰهه هواه"

(کیا آپ نے اس کو دیکھا جس نے ہوائے نفس ہی کو اپنا خدا بنالیا)۔

ان جیسے لوگوں کے نزدیک ہوائے نفس کے وہی خصائص ہیں جو مسلمانوں کے نزدیک الوہیت کے لئے ضروری ہیں۔ کیونکہ خدا وہ ذات ہے جس کی عبادت و اطاعت کی جاتی ہے، جس سے ڈرا جاتا ہے، اور امیدیں وابستہ کی جاتی ہیں۔ کیا ان خواہشات کے بندوں نے اپنی خواہشات کے آگے اپنے سر نہیں جھکائے اور ان کی پسند و ناپسند میں اطاعت و فرمانبرداری نہیں کی؟ . . . . . کیا اب یہ انھیں ناراض کرسکتے ہیں اور ان کے حکموں کی خلاف ورزی کی جرأت رکھتے ہیں۔

عبودیت صرف قید و بندی کا نام نہیں کیونکہ یہ غلامی کی ادنیٰ اور سریع الزوال قسم ہے۔ بلکہ حقیقی غلامی پختہ اور مستحکم عادت اور قابل اطاعت، لذت و شہوت کو کہتے ہیں ــ اسی طرح آزاد اسے نہیں کہتے ہیں کہ آدمی میں ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل ہونے کی قدرت ہو، اس لئے کہ یہ بڑی سستی اور آسان قسم کی آزادی ہے ــــ آزادی درحقیقت یہ ہے کہ تمہیں اپنی خواہشات اور اپنے اندر کی جزو شر کے جذبات پر قابو ہو ــــ عادت

تمہیں اپنا غلام اور تابع نہ بنائے اور ہوائے نفس تم سے لذت کوشی کی طالب نہ ہو۔

اسی اعتبار سے متدین مسلمان آزاد ہیں، جن کی آزادی ہر قید و بند سے بے نیاز ہے — اور جنھوں نے اپنے دلوں کو مطامع اور بیجا خواہشات سے آزاد رکھا، خالق کائنات سے اپنے تعلقات جوڑے، اور اپنے ارادوں کو اسی کے ارادے سے وابستہ کیا۔ درحقیقت اللہ ہی خیر و محبت، رحمت و رأفت کا عنوان ہے، جسے اس کی عبودیت و غلامی نصیب ہوئی وہ سارے صفاتِ ذمیمہ سے آزاد اور پاک ہوگیا —

انسان چونکہ کسی نہ کسی نظریہ، رجحان و خیال اور عادت و خصلت کا تابع ہوتا ہے، لہٰذا جو حق و صداقت کے پرستار ہیں، وہ باطل پرستوں سے معزز و مکرم ہیں — جنھوں نے انسانی و فطری رجحان و نظریہ کو اپنایا وہ شہوانی و شیطانی رجحان اپنانے والوں سے افضل اور بہتر ہیں، اور جنھوں نے حق تعالیٰ کے امر و نواہی کی بجاآوری کی وہ ان سے زیادہ ہوشمند و زیرک ہیں جو زن پرستی، شراب نوشی یا حُبِّ مال و جاہ اور لذت اندوزی میں مبتلا ہیں — آئے دن اس کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ بعض "خفیف العقل" ترقی پسند حضرات اپنے والدین کے رکھے ہوئے نام "عبد اللہ اور عبد الجواد" کو محض اس لئے ناپسند کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ عبودیت کا پیوند لگا ہوا ہے — لیکن یہی لوگ (جو خالق کائنات کی عبودیت سے بغاوت کی کوشش کرتے ہیں) محض اپنی معمولی و حقیر خواہش کے لئے دوسروں کی غلامی اختیار کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے انھیں دیکھ کر تمہیں ایسا محسوس ہوگا کہ وہ تمہارے غیظ و غضب سے زیادہ تمہارے رحم و کرم کے مستحق ہیں —

جن لوگوں میں اللہ کی عبودیت و بندگی کا جتنا جذبہ ہوگا، اتنے ہی وہ آزاد ہونگے، انھیں نہ کوئی مہوش و پری رُخ اپنے دام تزویر میں پھنسا سکتی ہے اور نہ ہوائے نفس کا اقتدار ہی ان کے دلوں پر قائم ہو سکتا ہے، نہ دولت و ثروت کی بہتات ان کی آنکھوں کو خیرہ کر سکتی ہے، نہ ان کی خودداری و شرافت نفس کے آبگینے شہوت پرستی کی دیواروں سے ٹکرا کر چکنا چور ہو سکتے ہیں اور نہ ان کی عزت و کرامت پر حرص و آز کے دھبے ہی پڑ سکتے ہیں، نہ خوف و ہراس، حزن و ملال کے بادل گھر سکتے ہیں کیونکہ حق تعالیٰ شانہ کی عبودیت و بندگی نے

انہیں دوسروں کے خوف سے آزاد کر دیا ہے۔

"الا إن اولياء الله لاخوف عليهم ولاهم يحزنون ۰ الذين آمنوا وكانوا يتقون ۰"

(آگاہ ہو جاؤ، اللہ کے دوستوں کو نہ کسی قسم کا خوف ہے اور نہ غم — جو لوگ ایمان لائے اور اللہ سے ڈرتے رہے)۔

"لهم البشرى في الحياة الدنيا وفي الآخرة ۚ لاتبديل لكلمات الله ۚ ذالك هو الفوز العظيم"

(یونس)

(دنیا و آخرت میں ان کے لئے خوشخبری ہے، اللہ کے وعدوں کو کوئی بدل نہیں سکتا یہی سب سے بڑی کامیابی ہے)۔

ان لوگوں نے اللہ کی عبودیت اختیار کر کے غیر اللہ کی تابعداری اور اس کے سامنے سر جھکنے سے یکسر انکار کر دیا، تو انھیں سیادت و قیادت بھی حاصل ہوئی اور حقیقی آزادی بھی، اخلاقی شرافت کی لازوال دولت بھی ملی اور غناءِ قلبی بھی — اور یہی حقیقۃً سب سے بڑی حریت اور آزادی ہے۔ اسی حقیقت کو ختمی رسالت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی زبان فیض ترجمان سے یوں واشگاف کیا

ليس الغنى عن كثرة العرض،

انما الغنى غنى النفس (بخاری و مسلم)

(غنا سامان (نعم) کی کثرت سے حاصل نہیں ہوتی، وہ درحقیقت بے نیازیٔ نفس سے پیدا ہوتی ہے۔

اور ابن عطاءؒ نے اسی حقیقت کی نقاب کشائی اس طرح کی ہے۔

انت حُرٌّ لما انت عنه آيسٌ وانت عبد لما انت له طامع ۔

(طبقات الصوفیہ للابی عبد الرحمٰن السلمی)

(جس چیز سے تم مایوس ہو اس سے تم آزاد ہو، اور جس کے خواہشمند ہو اس کے غلام ہو)۔

ہماری مندرجہ بالا تشریح کی روشنی میں صوفی کبیر شیخ احمد بن خضرویہ کے اس حکمت آمیز قول "في الحرية تمام العبودية، وفي تحقيق العبودية تمام الحرية"[1]

(یعنی آزادی کے اندر مکمل غلامی ہے لیکن غلامی کے اندر مکمل آزادی مضمر ہوتی ہے) کے معنی بے نقاب اور واضح ہو جاتے ہیں —

[1] احکام الصیام و فلسفتہ ص (از مصطفیٰ سباعی مرحوم)

بقیہ صفحہ ۱۶

حل نظر نہیں آتا۔ تم کمرہ میں جا کر آنسو گراتی ہو۔ تمہاری بے یار و مددگار ہونے کی کیفیت تمہارے دماغ پر بوجھ ڈالے ہوئے ہے۔

وہ کہتی ہے:-

اب میرا فیصلہ یہ ہوا کہ میں بچے کو رکھوں اس کے بعد دماغی بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے گا، بچہ پیدا ہوا اور میں نے محسوس کیا کہ میں بچے کے قریب ہوں۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ میں ہوں اور میرا بچہ جس سے کسی قدر تسکین ہوتی ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کسی کو میری فکر نہیں، گھر واپس ہو کر بھی کفالت، ہمدردی سب نفی میں ملیں گی۔ گھر پر میری ماں ہے میں اس کی تقلید کرنا نہیں چاہتی۔ وہ ملازمت ہے ایک آفس میں کام کرتی ہے۔ اکثر بیمار رہتی ہے اس میں اور میرے باپ میں جب کہ میں ۶ ماہ کی تھی طلاق ہو گئی تھی باپ پرورش کے لئے کچھ رقم بھیجتا تھا۔ مگر گھر کی حالت ایسی تھی کہ اکثر اوقات کھانا نصیب نہ ہوتا۔ ماں مجھے لے کر کھانے کے وقت پڑوس کے رہنے والے کے گھر پہنچ جاتی۔ اس طرح کچھ کھانے کو مل جاتا تھا۔ جس طرح میری پرورش ہوئی مجھے بالکل پسند نہ تھا۔ ایسے مراحل سے گزری ہوں جہاں تذکرہ کرنا نہیں چاہتی۔ ماں مارتی تھی سوٹے سے کام لیتی تھی آخر تنگ آمد بجنگ آمد پر عمل کرتی تھی، میں بھی ضرب سے کام لیتی تھی میں ایسی ماں بننا نہیں چاہتی۔ اس سنٹر پر بچوں کے ساتھ پیار سے کام لیتی ہوں "۔

نیویارک یونیورسٹی کے میڈیکل سنٹر کے ڈاکٹر کی رائے:-

ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ دیکھا گیا ہے کہ الفت اور محبت سے پُر خاندان کے کسی لڑکی کو بچہ کے رکھنے کی خواہش نہیں ہوتی کیونکہ اُسے اس بات کا قوی احساس ہوتا ہے کہ اُسے زندگی میں ایک اہم رول ادا کرنا ہے۔ کبھی غلط کاری کا شکار ہوتی ہے تو برتھ کنٹرول استعمال کرتی ہے، یا پھر اسقاط حمل کی طرف مائل ہوتی ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ ایک چودہ یا پندرہ سالہ لڑکی کو بچہ پیدا کرنے کی خواہش کے مختلف عوامل ہوتے ہیں، اب غریب اور امیر خاندان میں اس لحاظ سے کوئی فرق نہیں باقی رہا۔ یہ ماننا کہ غریب اور سیاہ فام میں ایسا ہوتا ہے بے معنی ہو گیا ہے۔ اس بات کے محرکات عنفوان شباب میں نفسیاتی سے لے کر معاشرتی حالات پر مبنی ہوتے ہیں۔ سب سے بڑا محرک خاندان کے مرکزیت کا ختم ہونا ہے۔ عام طور پر والدین کی مثالی نمونہ کا فقدان ہے۔ ایسی اہم تبدیلی کے زمانہ میں جبکہ شباب کا آغاز ہوتا ہے کوئی صحیح رہنمائی نہیں ملتی۔ لڑکیاں بیچارگی اور

قنوطیت کا شکار ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر کی نظر میں ایسے نوجوانوں لڑکے اور لڑکیوں میں حقیقی احساس یا سمجھ کہ گھر یا خاندان کی کیا اہمیت ہے ہوتی نہیں۔ زندگی میں کیا رول ادا کرنا ہے اس سے بے خبر ہوتی ہیں۔ اپنی اس بے راہ روی کی زندگی میں بچہ کی طرف رخ کرتی ہیں جو ان کی انفرادیت کو اُبھارتا ہے اور بلوغیت کا احساس پیدا کرتا ہے۔ زندگی کا مقصد آنکھوں کے سامنے کوند جاتا ہے اور ان میں نسائیت کام کرنے لگتی ہے، ڈاکٹر سنٹر کی رائے ہے کہ لڑکی اس منزل پر پہلی بار حقیقی فیصلہ لینے پر مجبور ہوتی ہے۔ وہ اسقاط حمل کے لئے ابھی دشواری محسوس کرتی ہے اور بے خبری کے عالم میں حمل کو قائم رکھتی ہے۔ ڈاکٹر اور سنٹر کے دوسرے ماہرین کی رائے ہے کہ یہ "وبا"، بچہ جننے کی جو آغاز شباب میں ہوتی ہے یہ علامتوں میں ایک علامت ہے جو معاشرہ میں ایک بڑی تبدیلی کی عکاسی کرتی ہے۔ آغاز شباب وہ زمانہ ہے جب کہ کسی اصول کی پابندی نہیں ہوتی بے نکیل زمانہ ہے اور اس دور میں لڑکیاں ظالم قسمت کے مہرے بن جاتی ہیں اور ان کو امریکن خواب کی کے غیر واضح نقوش اور کیفیات بغیر نشاندہی کے بے راہ روی کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس امریکن زندگی کا مطمح نظر یہ ہوتا ہے کہ ہر آنے والی نسل سابق سے زیادہ ترقی یافتہ ہو گی۔ اگرچہ نئی نئی راہوں کی تلاش ہو رہی ہے مگر سکون۔ روحانیت، محبت، ہمدردی حاصل نہیں کیونکہ ؎

ایں خیال است و محال است و جنوں

معاشرہ کا شیرازہ بکھرتا جائے گا۔ دولت کی فراوانی، مادیت، نفس پرستی کا شکار ہوتی جائیگی اور ایسی تہذیب خودکشی کرلے گی۔

ایسا کیوں ہے ؟ پادریت نے حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا قرار دیدیا ہے جو صاحب کے گناہوں کا کفارہ بنکر صلیب پر چڑھ گئے (نعوذ باللہ) حضرت مریم کی تقلید میں بن بیاہے ماں بننے کا شوق بڑھ گیا ہے۔ خاندانی رشتہ (ماں، باپ، بیٹے، بیٹی کا) مضمحل ہو گیا ہے۔

چوری کیوں ہوئی ؟ قتل کیوں کیا گیا ؟ زناکاری کیوں ہوئی ؟ یہ سب سمجھ بن کر یہاں تحقیقات کے نذر ہوتے رہتے ہیں۔ ابھی ابھی ایک شخص نے Son of Sa— کے نام سے چھ اشخاص کو ریوالور کا نشانہ بنایا، سات آدمیوں کو زخمی کیا۔ میڈیکل، نفسیاتی تحقیقات کی موشگافیوں کے سایۂ امن میں بسر کر رہا ہے۔ امریکہ اسلامی قصاص جیسی حیات پوشیدہ ہے اس سے بے بہرہ ہے۔ مغرب اسلامی اصولوں کا محتاج ہے، جو امن عالم کا ضامن ہے۔

ندوۃ العلماء کا دوسرا اجلاس

منعقدہ اپریل ۱۸۹۵ء

منزل بمنزل

قسط نمبر ۳

مولانا انعام اللہ صاحب کے بعد مولانا شبلی نعمانی نے علماء کے فرائض پر ایک جامع اور مدلل مضمون سنایا، مولانا نے فرمایا کہ:-

"جس زمانے میں یہاں اسلامی حکومت قائم تھی اس وقت قوم کے دینی اور دنیوی دونوں قسم کے معاملات علماء کے ہاتھ میں تھے۔ نماز، روزہ وغیرہ کے احکام بتانے کے علاوہ علماء ہی ان کے مقدمے فیصل کرتے تھے، علماء ہی جرائم پر حد و تعزیر کی سزا دیتے تھے، علماء ہی قتل و قصاص کے احکام صادر کرتے تھے، غرض قوم کی دین دنیا دونوں کی عنانِ اختیار علماء کے ہاتھ میں تھی، اب جبکہ انقلاب حکومت ہو گیا اور دنیوی معاملات کے فیصلے گورنمنٹ کے اختیار میں آگئے تو ہم کو دیکھنا چاہیے کہ قوم سے علماء کا کیا تعلق باقی ہے یعنی گورنمنٹ نے کسقدر اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے ہیں اور کس قدر باقی ہیں، علماء کی عزلت نشینی بلکہ بے پروائی نے عام طور پر یقین دلا دیا ہے کہ ان کو جو تعلق قوم سے باقی رہ گیا ہے وہ صرف مذہبی تعلق ہے یعنی یہ کہ صرف نماز، روزہ وغیرہ کے مسائل بتا دیا کریں، باقی معاملات میں دست اندازی کا انہیں کوئی حق حاصل نہیں، الحاد و دہریت کی طرف جو میلان عام ہوتا جاتا ہے اس کا روکنا گورنمنٹ کو ممکن ہوتا تو زیادہ نہیں تو مذہب عیسوی کو تو اس سے محفوظ رکھ سکتی۔ لیکن ہمارے علماء معقول طریقہ پر اس کو روکنا چاہیں تو اس طرح قلع قمع کر سکتے ہیں، جس طرح یونانی فلسفہ کے پھیلنے کے وقت امام غزالی، قاضی عضد الدین ابن رشد نے زندقہ و الحاد کا استیصال کر دیا تھا۔"

مولانا شبلی نعمانی کا یہ مضمون سوا گھنٹے میں ختم ہوا، ۹ بج چکے تھے جمعہ کا دن تھا اس لئے جلسہ ختم کیا گیا۔

کارروائی نشست دوم: اس نشست کا وقت ۵ بجے سہ پہر سے ۹ بجے شب تک مقرر کیا گیا تھا۔ نماز جمعہ مولانا شاہ امانت اللہ فصیحی غازیپوری نے پڑھائی۔ ۵ بجے وقت معین پر کثیر مجمع جمع ہوا۔ اوّلاً مولانا شاہ سلیمان پھلواروی نے اپنے مخصوص انداز میں خطاب فرما کر سامعین پر رقت بھی طاری کر دی اور ان میں جوش و ولولہ بھی بھر دیا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں اس طرف بھی توجہ دلائی کہ:-

"ندوہ نے جس عظیم الشان کام کی بنیاد ڈالی ہے، اس کی کامیابی ہنسی کھیل نہیں، دوچار روز کا کام نہیں، کوئی بڑا کام خیال کے ساتھ ہی نہیں ہو جاتا، بلکہ ہم کو ہمت بلند اور استقلال دیرپا کے ساتھ نہایت کوشش اور سعی بلیغ کرنی چاہیے۔ انشاء اللہ ایک روز ندوہ کو کامیاب دیکھیں گے۔"

مولانا شاہ سلیمان پھلواروی کے علاوہ مولانا شاہ امانت اللہ فصیحی غازیپوری، مولانا محمد عبد اللہ انصاری اور مولوی یعقوب علی صاحب نے بھی تقریریں کیں۔

دار الافتاء کا قیام: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ایک ایسا زمانہ آئے گا جب علم دنیا سے اٹھ جائے گا اور سیادت جاہلوں کے ہاتھ میں آجائے گی اور خود گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے کچھ اس قسم کے حالات اس زمانہ میں بھی تھے، جسے ذرا شُد بُد ہو جاتی تھی وہ اپنے کو فتوی کا اہل سمجھنے لگتا تھا، اور جبہ و دستار پہن کر مخلوق کو اپنے دام تزویر میں گرفتار کرنے لگتا تھا، یہ دراصل دین کے نام پر ایک کاروبار تھا، یہ لوگ اپنے مفاد کی خاطر دوسروں کی تکفیر و تفسیق کرتے، نتیجہ یہ تھا کہ ملت کی زبوں حالی بڑھتی جاتی تھی اور خانہ جنگی جگ ہنسائی کا باعث تھی اس کے علاوہ زمانہ کے تغیر کی وجہ سے جو نئے نئے مسائل پیدا ہو رہے تھے اور جن کا ذکر کتابوں میں صراحت کے ساتھ نہیں۔ ان کے احکام پر غور و تحقیق کے لئے بھی علم دین میں رسوخ کے ساتھ نئے حالات و تغیر کا باریک بینی سے مطالعہ ایک مفتی کے لئے ضروری تھا، غرض ایک عرصہ سے ایسے دار الافتاء کے قیام کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جہاں مخلص و لائق علماء و فقہاء افتاء کے فرائض انجام دے سکیں اور عوام ان سے بسہولت رجوع کر سکیں، ندوۃ العلماء نے اپنے اس دوسرے اجلاس میں اسے مقصد قرار دیا چنانچہ اجلاس لکھنؤ کی تیسری نشست میں جو ۱۳ اپریل ۱۸۹۵ء مطابق ۱۷ شوال ۱۳۱۲ھ کی صبح ہوئی، ناظم ندوۃ العلماء مولانا محمد علی مونگیریؒ نے دار الافتاء کی تجویز پیش کی، مولانا کو اس مسئلہ سے خاص دلچسپی تھی انہوں نے پوری قوت کے ساتھ یہ تجویز پیش کی، مولانا عبد الحق صاحب حقانی اور مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی نے تائید میں تقریریں بھی کیں، لیکن بعض حضرات نے اس کی فوری منظوری سے اتفاق نہیں کیا، بالآخر یہ تجویز ایک خصوصی جلسے کے لئے ملتوی ہو گئی (محرم ۱۳۱۳ھ) میں ایک خصوصی جلسے میں مولانا محمد علی مونگیریؒ نے بہت تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ پر روشنی ڈالی اور خاصے مباحثے کے بعد یہ تجویز منظور ہوئی)۔

اس کے بعد مولانا عبد الحق صاحب حقانی نے اپنا لکھا ہوا خطبہ بیان کیا جس میں انہوں نے اسلام کی ترقی اور تنزل کا بڑا موثر نقشہ کھینچا، سامعین ان کی خطابت سے بہت محظوظ و متاثر ہوئے۔

پھر مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی نے اپنا تحریری مضمون پڑھا، بعد مولانا ابراہیم صاحب آروی نے بڑے جوش و درد کے ساتھ ایک گھنٹہ تقریر کی، اس تقریر میں انہوں نے خلوص و دردمندی کے ساتھ اتحاد و اتفاق کی ضرورت پر زور دیا، ان کی تقریر سے لوگوں کے دل دہل گئے اور آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ اس نشست میں مولانا محمد یونس خانصاحب نے عربی قصیدہ اور جناب ابو القاسم فضل رب عرشی سنائی، شاعر خاص حضور نظام والی حیدرآباد اپنی فارسی مثنوی ایرانی لہجے میں پڑھی، جس میں ندوۃ العلماء کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

انجمن ندوہ کہ نامش شدہ	رحمت حق حامی کامش شدہ
رومی و بومی ہمہ گشتند جمع	صورت پروانہ حوالی شمع
کار مریضاں بمسیحا رسید	سلسلۂ قطرہ بدریا رسید
ندوہ طبیب است و مریض است قوم	سود بر د عہدہ الگو بست قوم
پیرویٔ انجمن ندوہ کن	فرق بنہ ہرچہ بگوید سخن

اسی دن سہ پہر کی نشست میں نصاب تعلیم کے مسئلہ پر کافی غور و خوض کے بعد ایک خاص کمیٹی بنائی گئی جو مسئلۂ نصاب کے ہر پہلو پر غور کر کے اپنی سفارشات پیش کرے۔ اس کمیٹی میں مولانا شبلی نعمانی پروفیسر علیگڈھ کالج، مولانا حفیظ اللہ صاحب مدرس اعلیٰ مدرسہ عالیہ رامپور، حافظ عبد اللہ صاحب مدرس اول مدرسہ احمدیہ آرہ، مولانا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی، مولانا حافظ عبد القادر صاحب، مولانا منصور علی خانصاحب، مولانا شاہ محمد حسین الہ آبادی، مولانا عبد الوہاب صاحب، مولانا عبد الجبار صاحب، مولانا غلام محمد صاحب فاضل ہوشیارپوری، مولانا عبد الوہاب صاحب مدرس آرہ، مولانا فضل حق صاحب رامپوری، مولانا نور محمد صاحب، مولانا انعام اللہ صاحب وغیرہ حضرات تھے۔

مسلم ہندوستان میں عرصہ دراز کے بعد یہ مجلس ایک ایسے مسئلہ پر غور اور لائحہ عمل طے کرنے کے لئے قائم ہوئی تھی، جس سے بڑے دور رس اثرات اور اہم نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔